الرسالہ
Al-Risala

November 1996 • No. 240 • Rs. 7

رات کی تاریکی کو ختم کرنے کی سادہ تدبیر
صرف ایک ہے
اور وہ ہے ـــــ آنے والی صبح کا انتظار۔

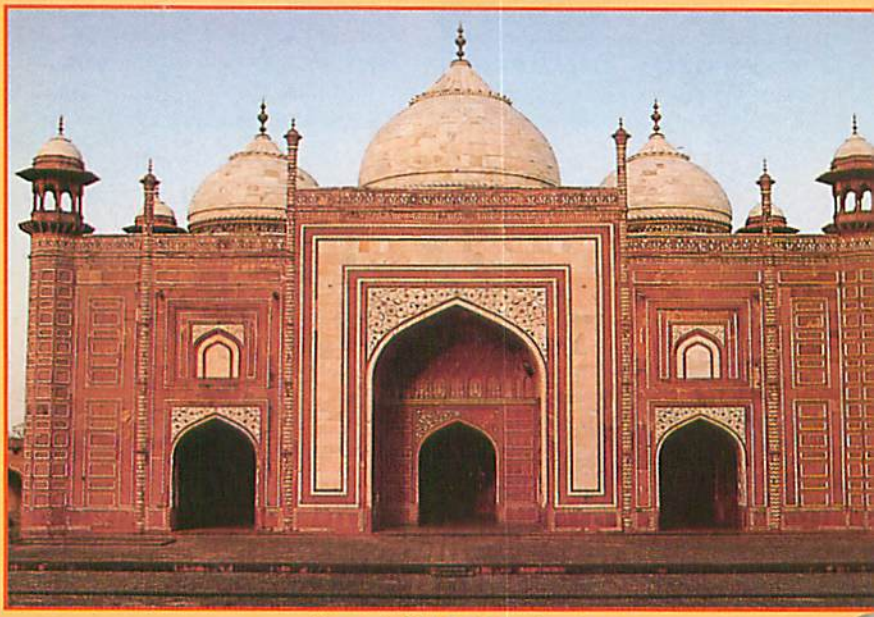

Mosque in Taj Mahal Complex, Agra

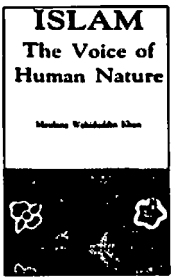

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE

22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30

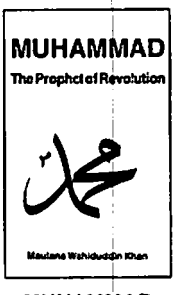

MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION

22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

GOD-ORIENTED LIFE

22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

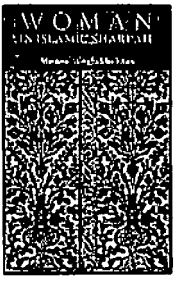

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH

22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)

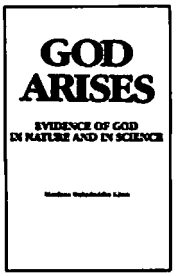

GOD ARISES

22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

ISLAM AS IT IS

22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55

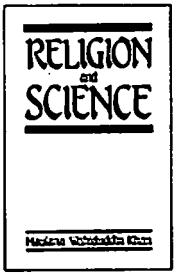

RELIGION AND SCIENCE

22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45

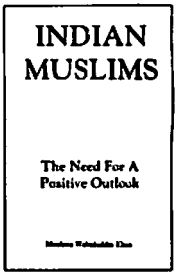

INDIAN MUSLIMS

22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۶ شمارہ ۲۳۹

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

میرٹھ کا سفر

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو دہلی سے میرٹھ (سردھنہ) کا سفر ہوا۔ یہ سفر بذریعہ کار تین گھنٹہ میں طے ہوا۔ میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی اور حکیم محمد کلیم صاحب شریکِ سفر تھے۔

دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے جگہ جگہ دکھائی دیا کہ صفائی کا کوئی اہتمام نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے تمام متعلق محکموں کے نام حکم جاری کیا تھا کہ وہ دہلی میں صفائی کا اعلیٰ اہتمام کریں اور اس کو خوب صورت شہر بنائیں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس ذیل) مگر دہلی آج بھی مجھے ویسی ہی نظر آئی جیسی وہ عدالت عالیہ کے اس حکم سے پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام اور سرکاری عملہ دونوں میں قانون کی تعمیل کا جذبہ موجود نہیں۔ پھر حکم جاری کرنے سے کیا فائدہ۔

عدالتِ عالیہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ گھروں گھروں میں پلاسٹک کی تھیلیاں فراہم کی جائیں۔ لوگ ان تھیلیوں میں اپنے گھر کا کوڑا ڈال کر اسے سڑک پر رکھ دیں اور صبح کو صفائی کرمچاری اسے اٹھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کوڑا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں اس کی سوسائٹی نے ایک سال پہلے اپنی کالونی کے لیے یہی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ گھر والے اپنا کوڑا

New Delhi, March 1: The Supreme Court today ordered all civic agencies to have Delhi cleaned and scavenged every day and directed both the state and the Union government to make it a "greener, cleaner place to live in". The directions were passed by a division bench comprising Mr Justice Kuldip Singh and Mr Justice Saghir Ahmed on a public interest litigation filed by a lawyer, B. L. Wadhera. The court approved an experimental scheme of the Municipal Corporation of Delhi and the New Delhi Municipal Committee for distribution of polythene bags for garbage disposal to the citizens of selected localities. The court directed that these garbage disposal bags should be collected in cleaned receptacles provided by the civic agencies to prevent garbage from being spread all over the garbage collection centres and on the nearby roads. The Central Pollution Control Board and the Delhi Pollution Committee will have the responsibility to ensure that this garbage disposal system works efficiently by deputing inspection teams and reporting the situation to the apex court every two months.

The Times of India, New Delhi, March 2, 1996.

سٹک کی تھیلیوں میں بند کر کے سڑک پر رکھنے لگے۔ مگر جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کیوں کہ دی پلاسٹک اکٹھا کرنے والے لڑکے یہ کرتے تھے کہ وہ کوڑا سڑک پر الٹ دیتے اور تھیلی لے کر بھاگ جاتے۔

کچھ عرصہ سے ہندستان میں ایک چیز کی بڑی دھوم ہے۔ اس کو جوڈیشیل ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔ اخباروں میں ہر روز اس کے بارہ میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ اس کے دفاع میں پریم کورٹ کے چیف جسٹس اے ایم احمدی نے دہلی میں ایک تفصیلی لکچر دیا۔ یہ لکچر دو قسطوں میں جوڈیشیل ایکٹوزم (Judicial Activism) کے عنوان سے ٹائمس آف انڈیا ۲۷ - ۲۸ فروری ۱۹۹۶ء میں چھپ چکا ہے۔

اس طویل تحریر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوڈیشیل ایکٹوزم یا عدالت کا جارحانہ رول (aggressive role) دستوری طور پر درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ قانونی نہیں ہے بلکہ عملی ہے۔ بہتر سماج یا بہتر سماج کی تشکیل میں قانون کا رول بہت جزئی ہے۔ سب سے زیادہ اہم چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ عوام کے اندر احساس ذمہ داری ہو اور انتظامی عملہ دل سے اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے آمادہ ہو۔ اس لیے پہلا کام اصلاح افراد کا ہے نہ کہ اصلاح حکومت کا۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ اسلام کے نام پر انقلابی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عام طور پر اسلامی بیداری (صحوۃ اسلامیہ) کہا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہیں اور ہر جگہ "اسلامی قانون نافذ کرو" کے مطالبہ کا ہنگامہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے وہ اسی طرح بے سود ہے جس طرح ہندستان کا موجودہ جوڈیشیل ایکٹوزم۔

ہندستان میں عدالتی فیصلوں کے نفاذ کے لیے اس کے موافق حالات موجود نہیں ہیں۔ اس لیے فیصلوں کے باوجود عملاً ان کا نفاذ نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں کسی بھی مسلم ملک میں وہ موافق سماجی فضا موجود نہیں ہے جو اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے بالفرض اگر کسی ملک میں نام نہاد اسلام پسندوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ حکومتی اداروں کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ شروع کر دیں تو وہاں اسلام کا قانون تو نافذ نہیں ہوگا،

البتہ اسلام لوگوں کی نظر میں مضحکہ ضرور بن جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد ہماری گاڑی دہلی سے نکل کر یوپی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اسی کے ساتھ ہم لوگ ایک اور ذہنی سفر میں مشغول ہو گئے۔ پورے راستہ میں سوال وجواب کی صورت میں مختلف موضوعات پر ہماری گفتگو جاری رہی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے موجودہ زمانہ میں انسان کو ایسی خود کار سواریاں دے دی ہیں کہ آدمی سفر بھی کرے اور عین اسی وقت وہ اپنا دوسرا کام بھی جاری رکھے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ آج کل سفر بہت آرام دہ ہو گیا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی چنانچہ سفر میں کبھی کبھی طبیعت چاہتی ہے کہ قصر کرنے کے بجائے مکمل نماز پڑھی جائے تاکہ سنت ادا کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں گنجائش بھی ہے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قصر ایک رخصت ہے، اور مکمل نماز پڑھنا افضل ہے۔ پھر سفر میں پوری نماز پڑھنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں اس کی بابت آیا ہے کہ تلك صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (یہ اللہ کی طرف سے ایک صدقہ ہے، پھر تم اللہ کے صدقہ کو قبول کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جو تقابل ہے وہ رخصت اور افضل کے درمیان نہیں ہے بلکہ رخصت اور صدقہ کے درمیان ہے۔ یعنی آپ اگر رخصت پر عمل نہ کریں تو آپ افضل کو نہیں لیں گے بلکہ خدا کے ایک عطیہ کو لینے سے انکار کریں گے۔ اور خدا کے عطیہ کو نہ لینا نعوذ باللہ خدا کی ناقدری ہے نہ کہ کوئی افضل عمل۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بیشتر اقدامات تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کا سبب غلط تقابل کی یہی فکری غلطی تھی۔ مثلاً پچھلے دو سو سال میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں جہاد کے نام پر بار بار ٹکراؤ کیا۔ لیکن ہر بار صرف تباہی اور بربادی ان کے حصہ میں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جہاد کا تقابل فرار سے کیا۔ وہ سمجھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ فرار کو چھوڑ کر جہاد کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ حالاں کہ ایسے تمام مواقع پر اصل تقابل جہاد اور اعداد میں تھا۔ یعنی ٹکراؤ نہ کر کے ان کے لیے پر امن تعمیر کے میدان میں سرگرم ہونے کا موقع تھا۔ لیکن غیر ضروری طور پر وہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پر امن تعمیر کے نہایت

یمتی مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں عبادت گزاری بڑھ رہی ہے۔ مگر اخلاقیات میں تنزل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ایک دین داری وہ ہے جو معرفت کی سطح پر ہو۔ دوسری دین داری وہ ہے جو عادت کی سطح پر ہو۔ آج کل کے لوگ زیادہ تر عادت کے تحت عبادت گزار بن گئے ہیں۔ لیکن اخلاق میں تبدیلی عارفانہ عبادت گزاری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو آپ شعوری عبادت گزاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ عادت کے تحت جو عبادت گزاری کی جائے اس سے ایک قسم کی نفسیاتی تسکین تو مل سکتی ہے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ آدمی کے اندر اخلاقی انقلاب پیدا کر سکے۔

ایک سوال یہ تھا کہ تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تنقید وہ ہے جو متعلق شخص کے اعلان کردہ یا ثابت شدہ موقف پر ہو۔ اور تنقیص وہ ہے جس کا خود آدمی نے اعلان یا اقرار نہ کیا ہو۔ اس مفہوم میں تنقید پوری طرح جائز ہے، اور تنقیص مکمل طور پر ناجائز۔

مثلاً الرسالہ میں صبر و اعراض کی پالیسی پر زور دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صبر و اعراض کا نام لے کر الرسالہ پر تنقید کرے تو یہ اپنے طریقہ کے اعتبار سے ایک جائز تنقید ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص الرسالہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ "الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے" اور پھر اس پر تنقید کرے تو یہ تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہوگی۔ کیوں کہ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ مسلمان بزدلی کی روش اختیار کر لیں۔ یہ دوسروں کی گھڑی ہوئی بات ہے نہ کہ ہمارا اپنا اعلان کردہ موقف۔

انھوں نے دوبارہ کہا کہ غیبت کی تعریف حدیث کی کتابوں میں یہ آئی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جائے۔ یہی تعریف خود تنقید پر بھی صادق آتی ہے، کیوں کہ تنقید میں بھی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جاتی ہے، حالاں کہ غیبت حرام ہے اور تنقید کو جائز ہونا چاہیے۔ پھر دونوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے۔

میں نے کہا کہ محض غیر موجودگی کی بنا پر کوئی تنقید غیبت نہیں بن جاتی۔ ہمارے مدارس میں اپنے امام کے سوا دوسرے اماموں کے مسلک پر تنقید کی جاتی ہے۔ حالاں کہ زیر تنقید امام وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مگر کوئی بھی اس کو غیبت نہیں قرار دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیبت کا تعلق اس

برائی سے ہے جو آدمی کا اپنا اعلان کردہ مسلک نہ ہو۔ جب کہ تنقید کا تعلق اس مسلک سے ہو ہے جس کا آدمی نے پہلے ہی علی الاعلان اقرار کر رکھا ہے۔ پھر اس کو غیبت کیسے کہا جائے گا۔

جو لوگ تنقید کو برا مانتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ہمارے مسلک کا ذکر کیوں کیا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مسلک پر تنقید کیوں کی۔ اگر ان کے مسلک کا صرف تذکرہ کیا جائے تو وہ خوش ہوں گے۔ البتہ جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ ناخوش ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کی ناخوشی تذکرۂ مسلک پر نہیں ہے بلکہ تنقید مسلک پر ہے۔ جب کہ غیبت وہ ہے جس میں خود تذکرہ ہی آدمی کے لیے ناخوشی کا باعث بن جائے۔

"جو لوگ پیغام حق سننے سے پہلے مر گئے ان کا انجام کیا ہوگا" ——— اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں، اور ہم غیب کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے مکلف نہیں۔ میں نے کہا کہ پچھلے زمانہ میں لوگوں نے اس طرح کے سوالات پر بہت زیادہ بحثیں کیں مگر یہ تمام تر فلسفہ کے زیر اثر تھا نہ کہ اسلام کے زیر اثر۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ تم کو علم قلیل (الاسراء ۸۵) دیا گیا ہے، اس لیے تم ان پر بحث نہ کرو۔ مگر قدیم فلسفہ موقف چوں کہ یہ تھا کہ انسان علم کلی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے زیر اثر لوگ اس طرح کے سوالات میں تعمق کرنے لگے۔

مگر موجودہ زمانہ کا غالب علم سائنس ہے۔ اور سائنس نے اس قسم کے تمام سوالات کا آخری جواب دے دیا ہے۔ سائنس نے بتایا کہ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر علم کلی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کو اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہیے۔ اس تحقیق کے بعد اب قرآن کا موقف ہی خود علمی اعتبار سے بھی واحد صحیح موقف بن گیا ہے (تفصیل کے لیے : مذہب اور سائنس)

جب بھی بذریعہ روڈ میں کسی سفر پر جاتا ہوں تو ایک منظر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہ سڑک کے کنارے الٹی ہوئی گاڑیاں ہیں۔ اس سفر میں بھی ایک ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ یہ منظر خود دہلی کے اندر تھا۔

اس طرح کے روڈ ایکسیڈنٹ پہلے زمانہ میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف جدید مشینی دور کی خصوصیت ہے۔ سست رفتار سواریوں کا دور اس قسم کے حادثات سے تقریباً خالی تھا۔ جب

دنیا میں تیز رفتار سفر کا زمانہ آیا تو ساری دنیا کی سڑکوں پر ایکسیڈنٹ ہونے لگے۔ ہر چیز کے کچھ ایڈوانٹج ہیں اور کچھ ڈس ایڈوانٹج۔ موجودہ دنیا میں معیاری زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

سواریوں کو گزارنے کے لیے سڑک کا طریقہ بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً موریہ سلطنت جس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے، اس کے حکمرانوں نے ایسی سڑکیں بنائی تھیں جن کے ذریعہ وہ اپنی پوری سلطنت میں سفر کر سکیں۔ واضح ہو کہ ان کی سلطنت ایک طرف دریائے سندھ سے دریائے برہم پتر تک اور دوسری طرف ہمالیہ پہاڑ کے کناروں سے لے کر وندھیا چل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم جدید طرز کی پختہ (hard-surfaced) سڑکیں اس وقت بنائی گئیں جب کہ صنعتی انقلاب آیا اور مشینی سواریاں انسانوں کو لے کر دوڑنے لگیں۔

انڈیا میں سڑکوں (یا ریل کی پٹریوں) کا معیار ابھی ترقی یافتہ ملکوں کے معیار سے بہت کم ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں اور قصبات میں جو سڑکیں میں نے دیکھی ہیں ویسی سڑکیں یہاں دہلی اور بمبئی میں بھی ابھی تک پائی نہیں جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا میں نہ ریل زیادہ تیز چلائی جا سکتی ہے اور نہ کار۔

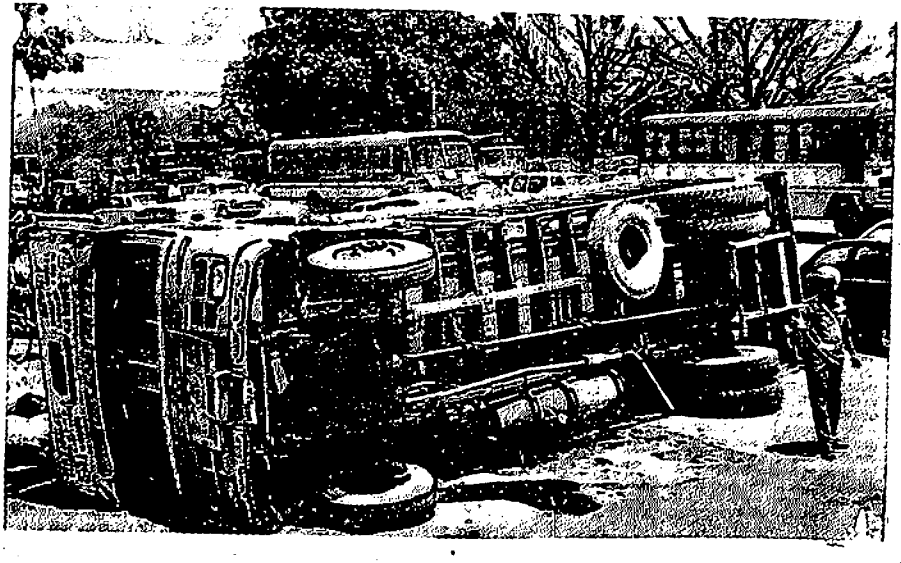

راستہ میں ہمیں میرٹھ سے گزرنا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ اور میرٹھ کے کچھ افراد سے ملاقاتیں کیں۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب کونسلر (Tel. 24610) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کچھ مسلمان بدظن ہیں اور وہ آپ کو بھاجپا کا آدمی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ لکھنؤ کے ایک بھاجپائی مسلمان کی دعوت پر لکھنؤ گئے اور وہاں ان کے زیر انتظام گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر کی۔

یہ ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کی بات ہے۔ محمد یامین صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ اتفاق سے اس وقت وہ لکھنؤ میں تھے اور وہ گنگا پرشاد میموریل ہال کے مذکورہ پروگرام میں شریک ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر تو فیصلہ بہت آسان ہے، آپ بتائیے کہ وہاں میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ انھوں نے کہا کہ شروع سے آخر تک سب آپ نے قرآن و حدیث کی باتیں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہاں اسٹیج پر نہ بھاجپا کا بینر تھا اور نہ اس کا اور کوئی نشان موجود تھا۔

میں نے کہا کہ پھر یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ وہاں کے اسٹیج سے لوگوں کے سامنے قرآن و حدیث کی بات پیش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مشرکوں کے بلانے پر ان کے یہاں گئے مدینہ میں آپ یہود کے بلانے پر ان کے پاس گئے۔ یہی ہمیشہ علماء کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور جہاں اور جس اسٹیج پر بھی اسلام کی بات کہنے کا موقع ملے گا وہاں اس کو پیش کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل قدر بات ہے نہ کہ قابل اعتراض بات۔

محمد یامین صاحب نے میلہ نوچندی میگزین (۱۹۹۳) کی ایک کاپی دی۔ اس میں میرٹھ کے بارہ میں کئی مضامین تھے۔ مگر سب کے سب ادبی زبان میں تھے۔ کوئی بات بھی محدد انداز میں نہ تھی۔ اس لیے میں ان سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

یہ صرف ایک میگزین کی بات نہیں۔ یہی اردو زبان کا عام مزاج ہے۔ بدقسمتی سے اردو زبان کا مزاج اقبال جیسے شاعروں اور ابوالکلام آزاد جیسے ادیبوں نے بنایا ہے۔ یہ لوگ لفاظی اور حقیقت نگاری کا فرق نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حقیقت کو بھی لفظی گل کاری کے انداز میں بیان کیا۔ یہی روایت اردو زبان میں عام طور پر قائم ہوگئی۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص نے کہا: الرسالہ پہلا پرچہ ہے جو اردو زبان میں سائنٹفک اسلوب کو رواج دے رہا ہے۔

اردو کا مسئلہ غلط رول ماڈل کا مسئلہ ہے۔ انگریزی زبان میں نیوٹن سے پہلے شاعروں اور
وں کو رول ماڈل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد جب سائنس کا غلبہ ہوا تو سائنس داں رول
ل بن گئے۔ اس طرح انگریزی زبان ادبی اسلوب کے دور سے نکل کر سائنسی اسلوب کے
ر میں داخل ہوئی۔ اردو میں اس قسم کا انقلابی عمل پیش نہیں آیا۔ کچھ شاعر اور ادیب جو ایک
اردو میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، سائنسی انقلاب جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آنے
سا پر، آج بھی وہی اشخاص لوگوں کا رول ماڈل بنے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کو
لے بغیر اردو کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سردھنہ پہنچے جو ضلع میرٹھ کا ایک قصبہ ہے۔
ب سے پہلے ہماری گاڑی تحصیل والی مسجد پر رکی۔ یہاں عصر کی نماز تیار تھی۔ چنانچہ یہاں عصر کی نماز
ت کے ساتھ پڑھی گئی۔ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے جو قصبہ کے بیرونی حصہ میں واقع ہے۔ پوچھنے
ا پا گیا کہ سردھنہ میں ۳۶ مسجدیں ہیں۔

کسی نئی بستی میں داخل ہونے کا یہی اسلامی طریقہ ہے۔ اگر وقت ہو گیا ہو تو پہلے مسجد میں داخل
مقامی مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اور اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو دو رکعت
ت پڑھ کر اپنے لیے اور بستی والوں کے لیے دعا کریں، اس کے بعد بستی کے اندر جائیں۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ روانہ ہو کر جناب تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی رہائش گاہ
، جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۱ میں ہوئی تھی۔ اس وقت
بار بار وہ مجھے سردھنہ آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ پانچ سال بعد اب اس کی تکمیل ہوئی۔

یہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آج
ر انسان پریشانی میں ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں خاموش تھا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب
لہا: اس لیے کہ وہ پڑوسی کو سکھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

تسلیم احمد صاحب کے اندر ایک عجیب صفت ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں وہ
ستقل طور پر یاد ہو جاتا ہے۔ سردھنہ کے ہزاروں آدمیوں کے نام ان کو مع ولدیت کے
۔

اس قسم کے حافظہ کو انگریزی میں فوٹوگریفک میموری کہا جاتا ہے۔ ایک صاحب سے یہ بار بات ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران مولانا آزاد کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ ان کو تو فوٹوگریفک میموری حاصل تھی۔ انھوں نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا: فوٹوجینک میموری۔ انھوں نے انگلش لٹریچر سے فرسٹ کلاس ایم اے کیا تھا۔ وہ سمجھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ میں خاموش رہا۔ چند دن کے بعد انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ تصویری حافظہ کے لیے فوٹوجینک کا لفظ نہیں ہے۔ اس کے لیے فوٹوگریفک میموری ہی ہے، جیسا کہ آپ نے کہا تھا۔

"انگریزی داں" طبقہ میں اس طرح کا اعتراف عام ہے۔ لیکن "عربی داں طبقہ" میں یہ اعتر اتنا کم ہے کہ کم از کم میں نے ابھی تک اس کا تجربہ نہیں کیا۔

تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی یادداشت ایسی ہے کہ ملاقات ہوتے ہی انھوں نے کمپوٹر کی طرح ہر بات تاریخ وار بتانا شروع کر دیا ——— ۱۹۸۷ سے میں مسلسل الرسالہ کا قاری ہوں آپ سے میری پہلی ملاقات ۵ مئی ۱۹۹۱ کو دہلی میں ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات پونہ میں ۳ اکتوبر ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ تیسری ملاقات ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ کو دہلی میں ہوئی۔ اس ملاقات میں آپ نے سردھنہ کے لیے ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ مگر چند دن بعد آپ کا خط آگیا کہ آپ اس تاریخ کو نہ آسکیں گے۔

انھوں نے اور بھی کئی باتیں یاد دلائیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ پونہ کی مجلس میں آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ لاتور کے علاقہ میں جو زلزلہ آیا ہے، کیا وہ عذاب الٰہی ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ وہ عذاب نہیں ہے بلکہ تنبیہہ ہے۔ شرعی اصطلاح میں عذاب آنے کے لیے اہل حق کی ہجرت شرط ہے۔ مشترک آبادی میں کبھی عذاب متأصل نہیں آتا۔

مغرب کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھی گئی۔ اس کا نام مسجد مکرہ نوابان ہے۔ بوڑھے امام صا نے یہ آیت تلاوت کی: والسماء بنیناها بایید وانا لموسعون (الذاریات ۴۷)

اس آیت میں پھیلتی ہوئی کائنات کی فلکیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (تذکیر القرآن ۲/۳۰-۶۲۹) تاہم اس میں ایک بالواسطہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو توسیع پسند ہے نہ کہ جمود۔ مگر اس توسیع سے مراد سیاسی یا جغرافی توسیع نہیں ہے بلکہ فکری توسیع

یعنی غور و فکر کے ذریعہ آدمی اپنے ذہن کو مسلسل وسیع کرتا رہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ کی وہ حالت نہ آئے جس کو فکری جمود کہا جاتا ہے۔

جناب تسلیم احمد ایڈووکیٹ کے مکان پر دیر تک نشست رہی۔ اس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

مسجد کرہ نوابان کے امام مولانا بدرالاسلام قاسمی نے بتایا کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد وہاں جو لڑائی ہوئی، اس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں موجود تھے۔ اس زمانہ میں مصری حکومت نے عربی زبان کے دو استاد دیوبند بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک شیخ عبدالمنعم النمر تھے۔ وہ آئے تو ان کے چہرہ پر داڑھی نہیں تھی۔ دیوبند کی فضا میں انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو دہلی ہوائی اڈہ پر پہنچ کر انھوں نے اپنی داڑھی منڈوا دی۔ اور اس کا بال اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: خذوا لحیتکم یا اھل الھند (اے ہندستان والو، یہ اپنی داڑھی لو)

امام صاحب قاری محمد طیب صاحب کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قاری طیب صاحب نے ایک بار کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس ایک شخص آیا اور سوال کیا کہ حضرت، یزید کیسا تھا۔ مولانا نانوتوی نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: شاعر بہت اچھا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو انگریزی میں ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے جس کا براہ راست جواب دینا کسی وجہ سے مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے موقع کے لیے جواب کا یہ طریقہ بہت موزوں اور مفید ہے۔

ایک اور صاحب نے بتایا کہ ایک بار الکشن کے زمانہ میں کانگرس والوں کو معلوم ہوا کہ فلاں حلقۂ انتخاب میں تبلیغ والے بہت ہیں۔ اور اگر مولانا یوسف صاحب (سابق امیر تبلیغ) کہہ دیں تو تمام تبلیغی لوگ کانگرس کو ووٹ دے دیں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہو جو مولانا یوسف صاحب سے یہ بات کہے۔ کسی کانگرسی نے بتایا کہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں آدمی مولانا حسین احمد مدنی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ کچھ لوگ مولانا حسین احمد مدنی کے پاس جائیں اور ان سے

درخواست کریں کہ وہ مولانا یوسف سے یہ بات کہہ دیں۔

یہ خبر تبلیغی مرکز میں پہنچ گئی۔ یہاں مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ مولانا یوسف صاحب تبلیغی سفر پر باہر چلے جائیں تاکہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے ان کی ملاقات ہی نہ ہو سکے۔ مولانا یوسف صاحب نے کہا کہ اس کے بجائے کیوں نہ ہم لوگ مل کر دعا کریں کہ اللہ ہمیں اس آزمائش سے بچالے۔ اس کے مطابق لوگ دعا میں مشغول ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا وفد جب دیوبند جاکر مولانا حسین احمد مدنی سے ملا اور مذکورہ درخواست کی تو انھوں نے وفد کو یہ جواب دے دیا : بھائی، مولوی یوسف ایک کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم کیوں ان کے کام میں خلل ڈالیں۔

دعا مخصوص اوقات میں کچھ یاد کیے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں، دعا ایک عمل اور ایک طریق زندگی ہے۔ دعا بجائے خود ایک تدبیر ہے۔ آدمی جب کسی معاملہ میں دعا کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنے اس یقین کو پختہ کرتا ہے کہ اس دنیا کا اصل مالک خدا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اسی کے اذن سے ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر یہاں کچھ ہونے والا نہیں۔ دعا ایک پکار ہے جو اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ کے عجز کی تلافی کے لیے اس کا خدا اس کی حمایت پر آجائے۔

اسی کے ساتھ یہ کہ آدمی جب اپنے کسی معاملہ میں دعا کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان بناتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو مثبت سمت میں متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو خارج رخی سوچ بنانے کے بجائے اس کو داخل رخی سوچ بناتا ہے۔ اس طرح دعا آدمی کی اندرونی قوتوں کو جگا کر اس کو پہلے سے زیادہ طاقت ور انسان بنا دیتی ہے۔

زیادہ عمر کے ایک صاحب نے بتایا کہ میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں کہ یا اللہ، تو میرے بیٹے کو دولت دینا تو پہلے اس کے استعمال کا سلیقہ دینا۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے زمانہ کی ماؤں کا طریقہ تھا۔ آج کے ماں باپ کا حال یہ ہے کہ وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا خوب دولت کمائے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کے بارہ میں نہ انھیں کوئی خبر ہے اور نہ کوئی تڑپ۔

ایک صاحب نے بعض اردو اخبارات کے حوالے سے عالمی سیاست پر ایک تیز و تند

تبصرہ کیا۔ میں نے کہا کہ محض اردو اخبارات پڑھ کر عالمی سیاست کے بارہ میں اس طرح کی رائے قائم کرنا درست نہیں، کیوں کہ اردو اخبارات نہایت ناقص ہیں۔ محدود اقتصادی ذرائع کی بنا پر وہ زیادہ لائق افراد کو اپنے ادارہ کے لیے حاصل نہیں کر پاتے۔ تمام اردو اخبارات میں تیسرے درجہ کے کارکن بھرے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اردو اخبارات ناقص خبر رسانی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ ابھی چند دن پہلے دہلی کے سب سے بڑے اردو اخبار کے شمارہ ۴ اپریل میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر چھپی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ برطانیہ میں بنائے گئے اس جہاز کی پرواز سات سال بعد شروع ہوگی۔ میں حیران ہوا کہ جب جہاز بن کر تیار ہو چکا ہے تو آخر وہ اتنی زیادہ دیر کے بعد کیوں اپنی پرواز شروع کرے گا۔ اس کے بعد یہی خبر جب ٹائمس آف انڈیا میں دیکھی تو اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ اگلے صفحہ پر دونوں اخباروں کی تصویر مع کیپشن نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس میں مدارس کے طرز تعلیم کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مفسر طنطاوی جوہری (۱۳۵۸ - ۱۲۸۷ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن میں فقہی نوعیت کے مسائل کے بارہ میں صرف ۱۵۰ آیتیں ہیں۔ جب کہ کائنات میں غور وفکر کے بارہ میں ۷۵۰ آیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے دینی تعلیم کے مدارس میں علوم کائنات کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ مدارس میں علوم کائنات سرے سے پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ جب کہ فقہی مسائل کا یہ حال ہے کہ وہی پورے تعلیمی نظام پر غالب آگئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں قرآن و حدیث کو بھی فقہ کے تابع کر دیا گیا ہے۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر شاندار گھر بنائے تو وہ اس کے اوپر لکھ دیتا ہے کہ ھذا من فضل ربی۔ مگر یہ قرآنی آیت کا ادھورا استعمال ہے۔ اگر کوئی لکھے تو اس کو پوری آیت لکھنا چاہیے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا کلمہ ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا تھا، اس پر آپ نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا میں ناشکری کرتا ہوں (النمل ۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی نعمت حقیقتہً فضل کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ ابتلاء (آزمائش)

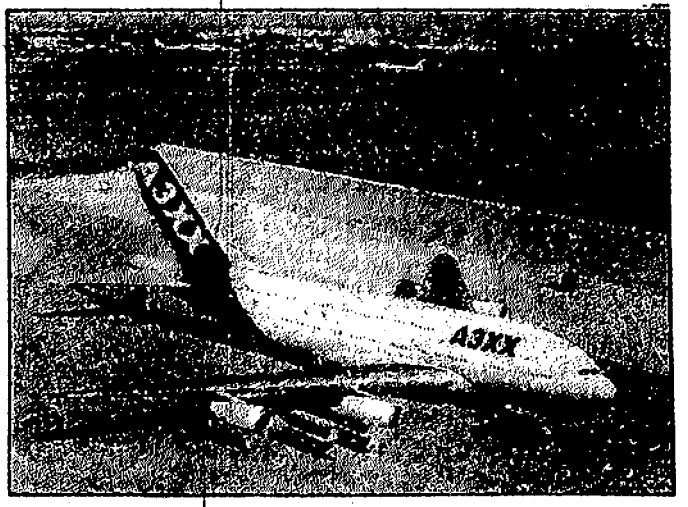

SUPERJUMBO: An artist's view of the Airbus A3XX which will be capable of carrying 600 passengers. It could be in service within the next seven years, it was announced in London on Wednesday.

ے لیے ہوتی ہے۔ دنیوی نعمت کو پاکر آدمی کے اندر ناز کی کیفیت پیدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ
ں کے اندر مسئولیت کا احساس مزید اضافہ کے ساتھ جاگنا چاہیے۔

قرآن کی اس آیت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا جو معاملہ ہے وہی اقتدار کا
عاملہ بھی ہے۔ اقتدار بھی بطور نوازش نہیں ملتا بلکہ بطور ابتلاء ملتا ہے۔ اگر آج آپ کے پاس
ولت ہے، اور کل دوسرا آدمی دولت مند ہو جائے تو آپ اس کو غاصب قرار دے کر اس
کے خلاف چیخ پکار نہیں کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس بھی دولت خدا کی طرف سے آئی
ئی اور اس کے پاس بھی دولت خدا ہی کی طرف سے آئی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اقتدار کا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار یا زمینی خلافت کسی قوم کا ابدی حق نہیں، جس طرح
ولت کسی گروہ کا ابدی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ مصلحت امتحان کے تحت خلافت ارضی کبھی ایک قوم
دیتا ہے اور کبھی دوسری قوم کو۔ سیاسی اقتدار بھی بہت سے امتحانی پرچوں میں سے ایک پرچہ
ہے۔ جس طرح دوسرے پرچے باری باری سب کو دیے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسی پرچہ بھی ایک
بعد دوسرے کو ملتا ہے، اور اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا۔

یہ تبدیلی کسی صلیبی یا صہیونی سازش کے تحت نہیں ہوتی بلکہ براہ راست خدائی قانون کے
ت ہوتی ہے (آل عمران ۲۶) اس بنا پر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس
قبول کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ خلافت ارضی جب ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل
و تو محروم گروہ ایسا نہ کرے کہ اس کو سازش اور غصب کا معاملہ قرار دے کر اس کے خلاف
نگامہ آرائی شروع کر دے۔ ایسا کرنا محرومی پر ہلاکت کے اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ اس کے بجائے
روم گروہ کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس کو خدا کا فیصلہ مان کر اس پر راضی ہو جائے۔

اس معاملہ میں خدائی فیصلہ کو مان لینا محروم قوم کے لیے عبادت کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ
ہوگا کہ اس کے اندر حقیقت پسندی پیدا ہوگی۔ اس کے اندر مثبت فکر جاگے گا۔ وہ اپنی
زوریوں کو دور کرنے میں لگ جائے گا۔ اس کے افراد سیاست کے سوا دوسرے خالی میدانوں میں
گرم عمل ہو جائیں گے۔ اس کی یہ روش عین ممکن ہے کہ خدا کی رحمت کو دوبارہ متوجہ کرے اور
ارہ اس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سردھنہ کے سید برہان الدین صاحب (ایم اے معاشیات) کی عمر اب ۶۵ سال ہو چکی۔ انھوں نے پاکستان سمیت بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات بتاتے ہوئے کہا: مسلمانوں کو نہ یہود سے خطرہ ہے، نہ عیسائیوں سے اور نہ ہندوؤں سے۔ مسلمانوں کو خطرہ صرف اپنی ذات سے ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مجلس میں کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی خاص کمزوری کیا ہے جس نے انھیں دوسری قوموں سے پیچھے کر دیا۔ مولانا محمد رضوان قاسمی نے کہا "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب شعور کی کمی ہے" یہ دور مقابلہ کا دور ہے۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بس دوسروں کی شکایت کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے رہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں زیادہ تر غیر مسلموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ بات آپ تجربہ کے تحت نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ کسی سے سن کر کہہ رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اپنے پاس سے کوئی رسالہ نکالیے۔ یہ بات خود ان کے گھر پر ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ گھر کے اندر سے الرسالہ کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ لے کر آئے۔

اس کی ورق گردانی کی تو اس میں غیر مسلموں کے دو حوالے تھے۔ مثلاً صفحہ ۸ پر پروفیسر مارگولیتھ کا وہ حوالہ جس میں انھوں نے اصحاب رسول کو ہیروؤں کی قوم کہا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ میں غیر مسلموں کے حوالے غیر مسلموں کے خیالات کی تبلیغ کے لیے نہیں ہوتے، وہ اسلام کی صداقت بیان کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا ایک مثل ہے کہ فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں (الفضل ما شهدت به الاعداء)

میں نے کہا کہ اس اعتبار سے غیر مسلموں کا حوالہ تو ایک خوبی کی بات ہے، اور ماضی سے لے کر حال تک کے تمام علماء اسلام اس قسم کے حوالے دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تو خوشی کی بات ہے، نہ یہ کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

سردھنہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۰ ہزار ہے۔ مگر ان کا اپنا کوئی قابل ذکر تعلیمی ا

نہیں۔ جب کہ جینیوں کی تعداد صرف چار ہزار ہے۔ اس کے باوجود وہ تعمیری و تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں، یہاں ان کے تین تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ لڑکیوں کا انٹر کالج، لڑکوں کا انٹر کالج، اور جونیر ہائی اسکول۔ اس کے علاوہ جین ہاسپٹل ہے جس میں آپریشن وغیرہ کا معقول انتظام ہے۔ ان حضرات کی باقاعدہ ایک سوسائٹی "جین ملن سوسائٹی" کے نام سے ہے جس کے تحت یہ تمام تعمیری کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہی حال عیسائی حضرات کا ہے وہ بھی تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار بھی کافی اونچا ہے۔

جین فرقہ اور عیسائی فرقہ کے خلاف ملک میں کوئی تعصب کی فضا نہیں۔ جبکہ مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بڑے پیمانہ پر تعصب پایا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ جین اور عیسائی جہاں ہیں وہاں وہ لوگوں کے لیے نفع بخش بن کر رہتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ مزاج نہیں پایا جاتا۔ دونوں کے معاملہ میں فرق کا اصل سبب یہی ہے۔

میرٹھ کے ایک گاؤں کا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہاں ایک خاندان ہے، اس کا مزاج یہ ہے نہ کسی سے کچھ لو اور نہ کسی کو کچھ دو۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ان لوگوں نے اپنی زمینوں میں محنت کر کے کافی پیسہ کمایا۔ مزید زمینیں خریدیں۔ نیا مکان بنایا۔ بستی میں ان کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہوگئی۔ گاؤں کے ماحول میں وہ شہر کی طرح رہنے لگے۔

اس کے نتیجہ میں گاؤں والوں میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے مگر دوسرے انھیں تکلیف دینے کے درپے ہو گئے۔ پہلے یہ کیا کہ ان کے ٹیوب ویل سے موٹر نکال لے گئے۔ ان کا ٹریکٹر غائب کر دیا۔ اس طرح کی حرکتوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑا تو اب یہ کیا کہ خود اپنے اندر کے ایک بوڑھے کو قتل کر کے مذکورہ خاندان کے تمام لوگوں کو فوجداری کیس میں پھنسا دیا۔ حتیٰ کہ اس خاندان کے ایک ہونہار نوجوان کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ۔

یہ بلاشبہ کمینہ پن ہے۔ مگر اس طرح کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی تعمیر کے ساتھ ایک اور تدبیر یہ کرنا چاہیے کہ وہ شر پسندوں کے شر سے کس طرح بچے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی جہاں رہے وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن کر رہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ انھیں اپنا احسان مند بنائے رہے۔ لوگوں کے شر سے بچنے کا یہ سب سے زیادہ آسان اور موثر طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں دونوں فریق کے درمیان جو جھگڑے ہوئے اس میں دونوں کا ملا کر تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ ہندستان کی کوئی بستی یا کوئی شہر نہیں جہاں مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے نزاعات نہ پائے جاتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے شمار جماعتیں، ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو مسلمانوں کے ان باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کر رہی ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کے نام پر ہر جگہ دھوم مچی ہوئی ہے، مگر اسلام کے لیے کسی گہرے اور دور رس کام کا کہیں وجود نہیں۔

مولانا محمد رضوان قاسمی یہاں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ دیا۔ اس پر سردھنہ کے ایک صاحب کا تاثر حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا تھا :

"الرسالہ پڑھنے کے بعد تمثیل احمد خان نے کہا کہ مولانا صاحب یہ کام تنہا نہیں کرتے بلکہ ایک ٹیم ہے جن کو مولانا نے مختلف میگزین اور کتابیں پڑھنے پر مامور کیا ہے۔ کسی کا کام اردو اخبار پڑھنا ہے۔ کسی کا کام عربی چیزیں پڑھنا۔ اور کسی کا کام انگریزی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا۔ یہ لوگ حسب ہدایت واقعات کی تعیین کر کے مولانا کو پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا ان واقعات کو مذہب پر منطبق کر کے الرسالہ کے لیے مضامین تیار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کام تنہا ایک آدمی نہیں کر سکتا۔ البتہ کمپوٹر کر سکتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسلسل چالیس سال مطالعہ کے بعد مولانا نے الرسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن نہیں ہوئے انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں اس قدر معیاری کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا اور ترتیب دینا ایک آدمی کا کام ہی نہیں"۔

ایک اور صاحب تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ الرسالہ تو سب کا سب سرقہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اتنی باتیں نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے یقین ہے کہ وہ ادھر اُدھر سے سرقہ کر کے ان کو مرتب کر دیتا ہے

میں نے کہا کہ الرسالہ دعا کی طاقت سے نکل رہا ہے مگر لوگ دعا کی طاقت کو نہیں جانتے۔ عام طور پر لوگ صرف رسمی دعاؤں سے واقف ہیں۔ یا وہ کسی بزرگ کے دعائیہ جلسہ میں شریک ہو کر آمین کہنے کو دعا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دعا اس سے بلند تر ایک شے ہے۔ دعا دراصل خدا کی یافت ہے۔ دعا معرفت حق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ دعا انسان کا حقیقتِ اعلیٰ کے ساتھ

کمال ہے۔ دعا گویا خزانۂ قدرت تک ایک انسان کی رسائی ہے۔ دعا جب اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو انسان کا سینہ تجلیاتِ الٰہی کا مہبط بن جاتا ہے۔ یہ دعا جب وجود میں آتی ہے تو کسی انسان کے لیے وہ لمحہ آجاتا ہے جس کی بابت حضرت مسیح نے فرمایا : مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔

ایک صاحب نے اپنا قصہ بتایا کہ سڑک پر میں ایک سواری کی زد میں آکر گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ اٹھا تو میں اسپتال میں تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہندوؤں نے مجھ کو زخمی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی گاڑی میں لٹا کر انھوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میری ہر طرح مدد کی۔ یہ قصہ بتا کر انھوں نے کہا : انسانیت ابھی زندہ ہے۔ شر پسندوں میں کچھ خیر پسند بھی موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ بہت سے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وہ جب ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہوتا ہے کہ بروں کی بھیڑ میں کچھ اچھے افراد بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح بات نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ غیر مسلم سب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی دشمن نہیں ہے تو وہ استثناء ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے۔ ہر ایک کے اندر انسانیت موجود ہے۔ فسادات کا سبب دشمنی نہیں۔ فسادات کا سبب وقتی اشتعال ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ جذباتی قسم کے لوگ اپنی کسی نادانی سے ایک بھیڑ کے نفس امارہ کو جگا دیتے ہیں۔ اور وہ بھڑک کر فساد پر اتر آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جذباتی لوگوں میں صبر و تحمل کی صفت پیدا کر دیں تو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے فسادات کا خاتمہ ہو جائے۔ اور ہر آدمی خیر پسند دکھائی دینے لگے۔

ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ میں نے اس کی ڈائری میں حسب ذیل نصیحت لکھ دی : زندگی کا راستہ ہموار راستہ نہیں۔ یہاں اونچ نیچ دونوں ہی آتے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر ہمت نہ ہارے، جو ہر حال میں یکساں عزم کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔

۱۱ اپریل کو عشاء کی نماز سردھنہ کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں نماز کے بعد تقریر کا پروگرام

تھا، نماز کے بعد بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ نماز کی اصل اسپرٹ کیا ہے اور ملت کی تعمیر میں اس کا رول کیا ہے۔

تقریر کے بعد دیر تک مصافحہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ مصافحہ کے بعد لوگ چلے جائیں گے۔ مگر کافی لوگ اس کے بعد دوبارہ بیٹھ گئے۔ چنانچہ سوال و جواب کی صورت میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران کئی اخبار کے رپورٹر آ گئے۔ ان میں ہندی اخبار کے رپورٹر بھی تھے اور اردو کے رپورٹر بھی۔ آخر میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ زندگی کا ایک سادہ اصول یہ ہے کہ جتنی محنت اتنی کامیابی۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے بڑی اخلاقی صفت اپنے خلاف سوچنا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں میں سرے سے موجود نہیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو یہاں میں نے جو تقریر کی تھی، اس کی رپورٹ اس علاقہ کے اخبار میں بھی چھپی۔ اس وقت کچھ اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے جنھوں نے تقریر کے آخر میں سوالات کیے۔ چوں کہ ۲۷ اپریل کو اور پھر ۳، ۷ مئی ۱۹۹۶ کو لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے الکشن ہونے والے ہیں، اس لیے الکشن کی بابت بھی سوالات کیے گئے۔ اگلے صفحہ پر ہندی روزنامہ امر اجالا (۱۲ اپریل ۱۹۹۶) کی شائع شدہ رپورٹ نقل کی جا رہی ہے۔

ایک مجلس تھی۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ہر ایک سے سوال کر کے اس کے اپنے میدان کے تجربات پوچھ رہا تھا۔ اس درمیان میں محمد حنیف صاحب نے سوال کیا کہ الرسالہ آپ اکیلے ہی لکھتے ہیں، یا اور بھی کچھ لکھنے والے لوگ ہیں، میں نے جواب دیا کہ میں اکیلا ہی لکھتا ہوں۔ مگر اس کی تیاری میں بہت لوگ شامل ہیں۔ حتیٰ کہ آپ لوگ بھی اس میں شریک ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ نے دیکھا، میں ہر ایک سے اس کے دائرہ کی معلومات لیتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرے پاس بہت سے لوگوں کے تجربات اکٹھا ہو جاتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ الرسالہ کو مرتب کرتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ اگرچہ ایک شخص کے قلم سے لکھا جاتا ہے مگر اس میں تنوع اتنا زیادہ

ہوتا ہے کہ وہ ۲۰ سال سے نکل رہا ہے۔ مگر آج تک لوگوں کی دل چسپی اس سے ختم نہیں ہوئی۔ اس کا نیاپن مسلسل باقی ہے۔

رات ہوئی تو سر دھتہ کے آسمان پر ستارے جگمگاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کسی شخصیت کی بڑائی بتانا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا تھا جیسے ستاروں کے درمیان سورج۔ مگر یہ صرف ایک ادبی اسلوب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سورج خود بھی ایک ستارہ ہے۔ مزید یہ کہ فلکیاتی تقسیم میں سورج نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ سمجھا جاتا ہے:

The Sun is classified as a dwarf star.

آسمان کے بیشتر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ معلوم کیا گیا ہے کہ ان کی جسامت (Volumes) سورج کے مقابلہ میں ایک ملین سے لے کر دس ملین گنا تک زیادہ ہے۔

رات کے وقت ستاروں کا خوب صورت منظر اب دہلی جیسے شہروں میں گویا معدوم ہو گیا ہے۔ دہلی میں فضائی کثافت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ وہاں اب نہ سانس لینے کے لیے

मौलाना वहीदुद्दीन खान ने सरधना में कहा: समृद्धि का आधार मेहनत है, आरक्षण नहीं

अमर ऊजाला ब्यूरो: सरधना, १२ अप्रैल। जाने-माने विचारक मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि आरक्षण की अपेक्षा मेहनत त्याग के बल पर अर्जित सफलता आत्मिक, सामाजिक, आर्थिक समृद्धि प्रदान करती है। नगर के बुध बाजार स्थित जामा मस्जिद में आज इशा की नमाज के बाद अकीदतमंदों को खिताब करते हुए उन्होंने नमाज की विस्तृत व्याख्या भी की। उन्होंने कहा कि नमाज सदर बनने के जज्बों से बचाती है। उन्होंने इत्तेहाद पर बल देते हुए कहा कि यह सबसे बड़ी ताकत है और इसमें जिस प्रकार नमाज के दौरान हम एक इमाम के पीछे सभी मुकतदी होते हैं, उसी प्रकार हमें सदर बनने की होड़ से स्वयं को उबारना चाहिए। बाद में मुस्लिम बुद्धिजीवियों व पत्रकारों के सवालों का जवाब देते हुए उन्होंने कहा कि इस्लाम यह सिखाता है कि दुश्मन से भी अच्छा सुलुक करो। जो आज दुश्मन है, कल वह मित्र बन जाएगा। भाईचारा कायम करने के मिशन पर निकले मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि इस्लाम के मुताबिक हम दुनिया भर में फैले हैं, अपनी बात को रखने के दो माध्यम हैं। एक दादागिरी, दूसरा दाई (देने वाला)। दादागिरी के बल पर कोई मिशन कामयाब नहीं हो सकता। आरक्षण संबंधी प्रश्न के उत्तर में मौलाना ने कुरान और हदीस की रोशनी में कहा कि हम तुमसे कोई अज्र नहीं मांगते। मांगना अपने आप को हकीर बनाना है। तरक्की का राज मेहनत है, आरक्षण नहीं। इंसान अपनी ताकत को पहचाने। हदीस में आया है कि रिजक का नब्बे फीसदी हिस्सा तिजारत में है। सीताराम केसरी (कल्याण मंत्री) के मुस्लिमों को आरक्षण देने की सिफारिश पर टिप्पणी करते हुए उन्होंने कहा कि 'वो बेवकूफ बना रहे हैं और हम बेवकूफ बन रहे हैं।' उन्होंने और कुरेदने पर कहा कि वे (कांग्रेस) १९४७ से लगातार हुकूमत कर रहे हैं, अब से पूर्व आरक्षण क्यों नहीं दिया गया। मौलाना ने आर्थिक मजबूती के लिए सहकारी समितियां बनाकर सहयोग का आह्वान किया। चुनाव के दौरान किस पार्टी का समर्थन किया जाए, सवाल के जवाब में उन्होंने कहा कि सही मायने में हालात ये है कि यदि चुनाव अच्छे-बुरे में हो तो बेशक अच्छे को चुनने के लिए कहा जा सकता है, लेकिन यहां तो चुनाव 'मिस्टर करप्ट' व 'श्री भ्रष्ट' के बीच है।

خالص ہوا ہے، اور نہ دیکھنے کے لیے فطرت کے آسمانی مناظر۔

موجودہ دنیا میں انسان دو مسئلے کے درمیان ہے۔ اگر تمدنی ترقی حاصل کی جائے تو فطرت کا حسن رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اگر فطرت کا ماحول اختیار کیا جائے تو وہ صرف تمدنی ترقیوں سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دونوں خوبیاں اپنی کامل اور معیاری صورت میں جنت کے سوا کہیں اور ملنے والی نہیں۔

۱۲ اپریل کو نماز فجر سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ صبح کی چائے جناب محمود علی خان صاحب کے مکان پر ہے۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ چنانچہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

محمد حنیف ملتانی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، راستہ میں نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے جگہ بنا کر نماز ادا کی۔ ایک ہندو مسافر نے دیکھ کر کہا کہ آپ تو بڑے دھارمک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ بھی تو پورے دھارمک ہیں۔ دیکھئے، آپ ہر دوار سے گنگا جل لیے چلے آرہے ہیں، اور جب پانی پینا ہوتا ہے تو اسی کو پیتے ہیں۔ اس کے بعد مذہب پر گفتگو ہونے لگی۔

محمد حنیف صاحب نے کہا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی قیمتی چیز میں ساجھا گوارا نہیں کرتا۔ پھر خدا تو سب سے زیادہ قیمتی ہے، اس میں ساجھا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔ اس طرح مثالوں کے ذریعہ انھوں نے شرک اور توحید کا فرق بتایا۔ اور کہا کہ شرک کا عقیدہ فطرت کے خلاف ہے اور توحید کا عقیدہ عین فطرت کے مطابق۔ مذکورہ ہندو مسافر نے بڑے دھیان سے سنا اور آخر میں کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاط کس طرح بجائے خود اشاعتِ اسلام کا ذریعہ ہے، کسی بھی طرح اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اختلاط بڑھ جائے تو دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد میرٹھ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد ہوتا رہا ہے۔ سردھنہ اس سے صرف ۲۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، مگر یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ میں نے لوگوں سے اس

کی بابت گفتگو کی۔ بظاہر یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب عمومی اختلاط ہے۔ سردھنہ کی آبادی ۶۰ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان ہیں۔ یہاں کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ بار بار دونوں فرقہ کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اس طرح تقریباً سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، یہی سماجی اور کاروباری میل ملاپ اس فرق کا اصل سبب ہے۔

میں نے کہا کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اختلاط مانع فساد ہے۔ اگر صرف اتنا ہو جائے کہ دونوں فرقوں کا اختلاط بڑھ جائے تو فساد کے اسباب اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۱۹۸۷ میں میرٹھ میں بہت بڑا فساد ہوا۔ اس کے بعد سردھنہ میں کسی نے شرارت کی اور مسجد میں خنزیر کا گوشت ڈال دیا۔ اس طرح کے کچھ واقعات کیے گئے تاکہ سردھنہ میں بھی فساد برپا ہو جائے۔ مگر یہاں کے لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ وہ مشتعل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے لوگ اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا، اب اس کو آگے بڑھنے نہیں دینا ہے۔ چنانچہ یہ چنگاری آغاز ہی میں بجھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرٹھ میں سخت نقصان ہوا۔ مگر سردھنہ میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہاں کے مسلمان آج ترقی کر رہے ہیں بزنس اور تعلیم دونوں میدانوں میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں میرٹھ فساد کے موقع پر سردھنہ کے تین مسلمانوں کو قریب کے گاؤں کساولی میں مار ڈالا گیا جب کہ وہ وہاں باغ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ مگر سردھنہ کے مسلمان اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ اس طرح ایک طرف مجرمین کو قانونی سزا ملی اور دوسری طرف سردھنہ فساد کی مصیبت سے بچ گیا۔

۱۲ اپریل کی صبح کو شیخ محمد حنیف ملتانی (۵۱ سال) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ غیر رسمی انداز میں دیر تک لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ سردھنہ میں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر بزنس کے میدان میں ہیں۔ تاہم ایک صاحب کے الفاظ میں "مسلمان تو زیادہ ترمزدوری کرتے ہیں۔ ہندو بزنس میں ہم سے بہت آگے ہیں"۔ میں نے سبب پوچھا تو ایک صاحب نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب صرف علم کی کمی ہے۔

ایک صاحب سے اس پر گفتگو ہوئی کہ کافر کون ہے۔ میں نے کہا کہ کافر کسی نسلی گروہ کا نام نہیں۔ یہ ایک انفرادی رویہ ہے۔ کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس سے مراد وہ انسان ہے جو اتمام حجت کے باوجود حق کا انکار کرتا رہے، یہاں تک کہ انکار ہی کی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔

قرآن (البقرہ ۱۶۱) میں ہے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ کافر ہی مر گئے تو وہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئك علیھم لعنۃ اللہ الخ)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا منکر وہ شخص ہے جو موت کے آخر وقت تک کافر بنا رہے۔ اب چوں کہ کوئی انسان کسی کے بارہ میں یہ جان نہیں سکتا کہ اس کا خاتمہ آخر کار کس چیز پر ہوا ہے، یہ وہ چیز ہے جو صرف خدا کو معلوم ہے۔ اس لیے ہمیں یہ حق نہیں کہ پیشگی طور پر ہم کسی کو کافر قرار دے دیں۔ ہمیں دوسروں کو صرف غیر مسلم کہنا ہے۔ یا انسان یا برادرانِ قوم جیسے الفاظ سے انھیں خطاب کرنا ہے۔ اور اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر دینا ہے کہ آخری طور پر اس کی موت کس حال میں ہوئی۔ کافر وہ ہے جو خدا کے نزدیک کافر قرار پائے نہ کہ انسانوں کے نزدیک۔

سردھنہ کا تعارف سب سے پہلے مجھے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس کے شمارہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۸ کے ذریعہ ہوا۔ اس میں مسز شوچی بنسل (Shuchi Bansal) کے قلم سے ایک باتصویر مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— سردھنہ، بیگم کا مامن :

Sardhana: The Begum's Haven

اسی وقت سے یہ خواہش تھی کہ سردھنہ کو دیکھا جائے۔ مگر ہر کام اپنے مقرر وقت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ آٹھ سال کے بعد یہ وقت آیا اور میں سردھنہ کو دیکھنے کی خواہش پوری کر سکا۔

سردھنہ ریلوے لائن پر نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ انڈیا کے سیاحتی نقشہ (ٹورسٹ میپ) پر نہیں ہے۔ تاہم اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ پورے ہندستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عیسائی حضرات اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس کے بارہ میں اخباروں میں رپورٹیں بھی چھپتی رہتی ہیں۔ مذکورہ انڈین اکسپریس کے علاوہ دہلی کے ہفت روزہ انڈین کرنٹس

۷ مارچ ۱۹۹۶) میں ایک معلوماتی مضمون مسٹر گلشن مہرا کے قلم سے چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— بیگم سمرو کی سرزمین میں :

In the land of Begum Samru

۱۲ اپریل کو جمعہ سے پہلے ہم لوگ سردھنہ کا مشہور سینٹ میری چرچ (St. Mary's Church) دیکھنے کے لیے نکلے۔ یہ سفر جناب علاؤالدین صاحب کی گاڑی میں طے ہوا۔ اس چرچ کا ذکر پہلی بار میں نے مذکورہ اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ ایک وسیع حصار بند علاقہ ہے جو گویا سردھنہ کے اندر ایک عظیم تر سردھنہ ہے۔ تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی یہ وسیع دنیا ایک خاتون نے بنوائی تھی جو عام طور پر بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہیں۔ عظیم چرچ کے گیٹ کے اوپر حسب ذیل فارسی قطعہ لکھا ہوا ہے :

بامدادِ خدا فضلِ مسیحا بسالِ ہجدہ صد عشرین واثنا
بدل زیب النساء عمدہ اراکین بنا فرمود عالی شان کلیسا

چرچ کے ایک کتابچہ سے معلوم ہوا کہ بیگم سمرو کا اصل نام فرزانہ تھا۔ ان کے باپ کا نام لطیف علی خان تھا۔ وہ میرٹھ ضلع کے ایک گاؤں کوتانہ میں ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی عمر چھ سال تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ذریعہ معاش کی تلاش میں ان کی ماں انھیں لے کر دہلی آگئیں۔ ان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی۔ چنانچہ انھوں نے رقص و سرود کا پیشہ اختیار کر لیا۔

جب ان کی عمر پندرہ سال تھی، ایک فرانسیسی افسر (Walter Reinhardt) نے ان کو ایک رقص پارٹی میں دیکھا۔ وہ اس کو پسند آگئیں اور اس نے ان سے نکاح کر لیا۔ ۱۷۶۵ء میں بیگم کا نکاح مسٹر سمرو سے خالص اسلامی روایات کے مطابق ہوا۔

مذکورہ فرانسیسی افسر کا اصل نام والٹرین ہارٹ تھا۔ مگر وہ سیاہ فام تھا، اس بنا پر اس کے یورپی ساتھی اس کو سومبرے (Le Sombre) کہنے لگے جس کے معنی تاریک کے ہیں۔ یہ لفظ بول چال میں بگڑ کر سُمرو (Sumru) بن گیا۔ اس طرح یہ فرانسیسی افسر سُمرو کہا جانے لگا۔ اور جب اس کا نکاح مذکورہ خاتون سے ہوا تو وہ بھی بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہو گئیں۔

مذکورہ فرانسیسی ابتداءً راجہ جواہر سنگھ (بھرت پور) کی فوج میں افسر تھا۔ اٹھارویں صدی

کے آخر میں دہلی کی برائے نام مغل سلطنت پر شاہ عالم ثانی تخت نشین تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں بغاوت ہوگئی۔ شاہ عالم کو دہلی سے بھاگنا پڑا۔ اس بغاوت کا سردار زبتہ خان تھا۔ شاہ عالم نے بغاوت کو فرو کرنے کے لیے والٹرین ہارٹ کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ایک فوجی ماہر تھا، وہ بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد شاہ عالم ثانی نے والٹرین ہارٹ کو مظفر نگر سے علی گڑھ تک کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔

۱۷۷۸ میں والٹرین ہارٹ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت بیگم سمرو اس کے نکاح میں آچکی تھیں۔ مگر ابھی تک انھوں نے عیسائیت قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے بیگم سمرو کو وارث کے طور پر مان لیا۔ اس طرح بیگم سمرو مذکورہ ریاست کی حاکم بن گئیں جس کی راجدھانی سردھنہ تھی۔ والٹرین ہارٹ کے انتقال کے تین سال بعد، مئی ۱۷۸۱ کو بیگم سمرو نے مذہب تبدیل کرکے باقاعدہ عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔

اس زمانہ میں بیگم سمرو کی فوج میں ایک یورپی افسر جارج ٹامس (George Thomas) تھا۔ اس کو بیگم سے دل چسپی ہوگئی۔ وہ بیگم سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر بیگم نے انکار کیا۔ اس کے بجائے انھوں نے ایک اور فرانسیسی فوجی افسر لاوئیسیا (Le Vaisseau) سے نکاح کرلیا۔

اس کے بعد بیگم سمرو کے مصیبت کے دن شروع ہوتے ہیں۔ بیگم سمرو کے سوتیلے لڑکے ظفریاب خان نے جارج ٹامس کو ساتھ لے کر بغاوت کردی۔ بیگم کو سردھنہ چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ اس سلسلہ میں بہت لمبی کہانی ہے جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔

۶۵ ایکڑ کے رقبہ میں یہاں جو مسیحی دنیا ہے اور جس میں چرچ وغیرہ شامل ہیں وہ سب انھیں بیگم سمرو کی بنوائی ہوئی ہیں۔ بیگم نے اسپتال کے نام سے ایک رقم چھوڑی تھی۔ چنانچہ ان کے بعد یہاں ایک اسپتال بنایا گیا جو اب تک قائم ہے۔ یہ اسپتال ۱۸۸۱ میں تیار ہوا تھا۔

اس مسیحی احاطہ کے اندر چرچ کے بعد جو سب سے بڑی اور شاندار عمارت ہے وہ بیگم سمرو کا محل ہے۔ اب وہ ایک انٹر کالج کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بیگم سمرو کی قدیم رہائش گاہ میں ایک پرائمری اسکول قائم ہے۔ اس کی ایک جھلک اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بیگم سمرو کا تعلق اپنے پہلے فرانسیسی شوہر والٹرین ہارٹ سے ۱۷۶۵ میں ہوا تھا۔ پھر

دوسرے سے۔ مگر کتابچہ میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بیگم سمرو اپنے فرانسیسی شوہروں سے بات کس زبان میں کرتی تھی۔ آیا اس کے شوہروں نے اردو یا فارسی سیکھ لی تھی یا خود بیگم نے فرانسیسی زبان میں بقدر ضرورت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بیرونی شخصیتوں سے تو وہ ترجمان کے ذریعہ بات کر سکتی تھی۔ مگر اپنے شوہر سے بات کرنے کے لیے تو ضروری ہے کہ دونوں براہ راست گفتگو کر سکیں۔ مگر اس سوال کا جواب مذکورہ کتاب میں موجود نہیں۔

چرچ کے گیٹ پر لکھا ہوا تھا : (St. Mary's Church) یہ بلند و بالا چرچ بیگم سمرو نے اٹلی کے معماروں کے ذریعہ بنوایا تھا۔ ہم لوگ اندر داخل ہو کر دیکھنے لگے۔ اس وقت چرچ کے اندر سروس (مسیحی عبادت) ہو رہی تھی۔ مگر اس میں اتنے کم آدمی تھے کہ وسیع چرچ کے اندر وہ ہمیں دکھائی نہیں دیے۔ مقامی مسیحی گائڈ جو ہمارے ساتھ تھا، اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے بعض ساتھی آپس میں بولنے لگے۔ ان کی آواز گونج کی وجہ سے زور زور سنائی دینے لگی، تاہم میں حسب عادت بالکل خاموش تھا اور کچھ بھی بولے بغیر چپ چاپ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

آواز سن کر ایک بھاری بھرکم خاتون اندر سے نکلی۔ اس نے غصہ کے انداز میں کہنا شروع کیا کہ یہاں سروس ہو رہی ہے اور یہ پتہ نہیں کون لوگ ہیں جو اس طرح یہاں آکر زور زور سے بول رہے ہیں۔ میں دوبارہ حسب عادت کچھ بھی جواب دیے بغیر باہر آگیا۔ اتنے میں گائڈ اندر

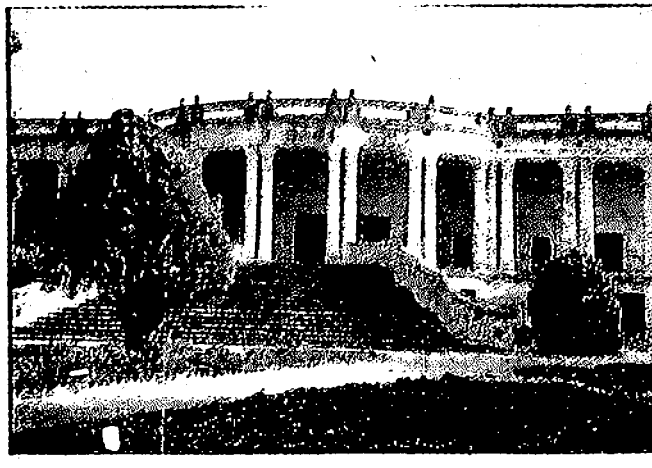

سے آیا۔ اس نے کہا کہ چلئے، آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ مگر میں نے دوبارہ اندر جانے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کے بعد بڑے پادری کو خبر ہوئی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر خود آگیا اور معذرت کر کے ہم لوگوں کو دوبارہ اندر لے گیا۔ وہ اگرچہ ایک خاص پروگرام میں مصروف تھا۔ لیکن پروگرام چھوڑ کر وہ آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہا۔ اور وسیع احاطہ کے مختلف شعبے ہمیں دکھائے اور ہر ایک کا تعارف کرایا۔

وسیع پھیلے ہوئے چرچ کے اندر ایک خاص کمرہ ہے جو سال میں صرف دو بار مخصوص تاریخوں پر کھولا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے اور برکت لینے کے لیے لاکھوں عیسائی یہاں جمع ہوتے ہیں۔ فادر نے اس کمرہ کو خصوصی طور پر آج ہمارے لیے کھلوا دیا۔ چرچ میں داخلہ کے وقت جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا، یہ غالباً اسی کا ایک خوش گوار نتیجہ تھا۔

اس کمرہ میں کچھ مسیحی تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ اور سامنے دیوار پر قد آدم مسیح کا اسٹیچو صلیب پر لٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا نقشہ اس طرح ہے کہ موت کے بعد سر ایک طرف لٹکا ہوا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں میں کیل گاڑنے کا خونی نشان ہے۔ سینہ پر بھالا مارنے کی وجہ سے خون بہہ رہا ہے۔ غرض یہ کامل طور پر ایک بے بس انسان کی تصویر تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں "بے بس خدا" کو ماننے والے ساری دنیا میں حرکت و عمل کا طوفان بن گئے۔ مگر "طاقت ور خدا" کو ماننے والے اپنی بے عملی کے نتیجہ میں ساری دنیا میں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم بنے ہوئے ہیں۔

اس مصلوب مجسمہ کے اوپر لکھا ہوا تھا INRI۔ میں نے پادری صاحب سے پوچھا کہ اس کا فل فارم کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ لکھ کر دیے:

Iesus Nazarenus Rex Iudeorum

یہ لاطینی زبان ہے۔ اس کا مطلب ہے ——— یسوع ناصری، یہودیوں کا بادشاہ:

Jesus, The Nazarene, King of the Jews

یہ ۱۲ اپریل کو ساڑھے دس بجے دن کا وقت تھا۔ ایک سن رسیدہ سسٹر نے آکر اس کمرہ کا تالا کھولا اور کہا مجھ کو ہندی بہت نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ آپ انگلش میں بتائیے۔ چنانچہ وہ انگریز

ں تعارف کراتی رہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ سسٹر، آپ کا شکریہ (Thank you, Sister)
اس نے جواب میں کہا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں :

We all are children of one Father.

میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کے اندر آپ نے جو اخلاق دیکھا اس کا راز کیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اس کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ——— مشنری اسپرٹ۔

چرچ کے بڑے پادری (Fr. John Monteiro) کی طرف سے انگریزی میں ۸۰ صفحہ کا ایک کتابچہ ہمیں دیا گیا جس میں اس مسیحی سنٹر کے بارہ میں تاریخی تفصیلات درج تھیں۔

۸۰ صفحہ کے کتابچہ میں بہت سی تفصیلات ہیں۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیگم فرزانہ جب ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوئی تھی تو اس نے کیوں مسیحیت قبول کر لیا۔ کتابچہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فادر گریگوری (Fr Gregory) ایک پرجوش مشنری (zealous missionary) تھے۔ وہ اٹلی میں ۲۲ نومبر ۱۷۴۳ کو پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرہ آئے۔ یہاں غالباً انھوں نے ہندستانی زبان سیکھی۔ اس کے بعد وہ سردھنہ منتقل ہوئے۔ ۷ مئی ۱۷۸۱ کو انھوں نے بیگم فرزانہ کو مسیحیت میں داخل کیا۔ ان کا نیا نام یوہانہ سمرو (Yohanna Sumru) رکھا گیا۔ فادر گریگوری کا انتقال دہلی میں ۲۹ مئی ۱۸۰۷ کو ہوا۔ دہلی میں رہتک روڈ پر اب بھی ان کی قبر موجود ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے بیگم سمرو سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ وہ ہندستانی زبان کے علاوہ فارسی زبان اچھی جانتی تھی۔ اس بنا پر علماء اس سے بہت اچھی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ مگر غالباً کسی بھی عالم کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اس طرح مسیحی پادری کو یک طرفہ طور پر یہ موقع مل گیا کہ وہ خاتون پر کوشش کرے اور اس کو بیگم فرزانہ سے بیگم یوہانہ بنا دے۔

مذکورہ کتاب میں یہ درج ہے کہ ——— اس میں شک نہیں کہ اس سفید پوش اطالوی راہب کو بیگم کی تبدیلیٔ مذہب کے لیے بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ اس نے بیگم کو اور اس کے سوتیلے لڑکے (ظفر یاب خان) کو آگرہ کے قدیم اکبر چرچ میں ۱۷۸۱ء میں بپتسمہ دیا۔ بارہ سال بعد اسی نے بیگم کا نکاح ایک فرانسیسی افسر سے کیا :

Undoubtedly this Italian Carmelite must have had a lot to do with the begum's conversion. He baptised her in the old Akbar Church of Agra along with Sumru's son in 1781. 12 years later he blessed her marriage with the Frenchman, Le Vaisseau. (p. 64)

یہ مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا جس نے دہلی سلطنت پر ۱۷۵۹ سے لے کر ۱۸۰۶ تک حکومت کی۔ خود بیگم سمرو کی جاگیر یا ریاست اسی سلطنتِ دہلی کے ماتحت تھی۔ اس اعتبار سے مسلم علماء کے لیے اس معاملہ میں دخل دینے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا اتنا بڑا واقعہ ہوا جس کا تعلق سردھنہ سے لے کر آگرہ تک سے تھا، اور جس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ لیکن اس مدت میں کوئی ایسا عالم سامنے نہیں آیا جو بیگم سمرو سے ملاقات کر کے اس کو اسلام کی اہمیت بتائے۔ بیگم سمرو صرف اردو اور فارسی زبان جانتی تھی مگر فرنچ اور انگریزی کے علماء سے تو اس کا ربط قائم ہوا، لیکن اردو اور فارسی کے علماء سے اس کا ربط قائم نہ ہو سکا۔

یہ وہ وقت ہے جب کہ دہلی میں شاہ عبدالعزیز صاحب (۱۸۲۳-۱۷۶۲) موجود تھے انھوں نے ۱۸۰۶ء میں فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ علماء "حرب" کے معاملہ میں تو ضرورت سے زیادہ باخبر تھے، مگر "دعوت" کے معاملہ میں وہ کسی باخبری کا ثبوت نہ دے سکے۔ ورنہ شاید آج سردھنہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

عین اسی زمانہ کا ایک اور ملتا جلتا قصہ ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر حرب بوائنے (Benoit de Boigne) ہندستان آیا تھا۔ وہ ۱۷۵۱ء میں چیمبری (Chambery) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ ہندستان میں وہ گوالیار کے راجہ مادھوجی سندھیا کی فوج میں افسر مقرر ہوا۔ جہاں وہ ۱۷۸۴ سے ۱۷۹۴ تک رہا۔

بوائنے نے شاہ عالم دوم کے ایک ایرانی افسر کی لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام علی بخش تھا۔ علی گڑھ میں موجودہ مسلم یونیورسٹی جس زمین پر قائم ہے وہ پہلے اسی فرانسیسی مہم باز (French Adventurer) کی ملکیت تھی۔ ۱۸ سال ہندستان میں رہ کر ۱۸۱۲ میں جب وہ فرانس واپس چلا گیا تو اس کے بعد یہ زمین کچھ اور لوگوں کو ملی۔ یہاں تک کہ

پر سردھنہ وہ مسلم یونی ورسٹی کے حصہ میں آئی۔

بیگم سمرو کی زندگی اس دور کے ہندستان کو بتاتی ہے جو یہاں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت کسی سلطنت کے تین اہم شعبے ہوتے تھے —— زراعت، انتظام حکومت اور فوج۔ ان میں بھی فوج کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ کیوں کہ اقوام متحدہ سے پہلے دنیا میں کوئی بین اقوامی قانون نہیں تھا اور اس قسم کے معاملات کو طے کرنے والی واحد طاقت صرف فوج تھی۔

اُس زمانہ میں حوصلہ آزما افراد کے لیے سب سے بڑی چیز فوجی سردار یا فوجی جنرل بنتا تھا۔ چنانچہ اکثر راجہ اور مہاراجہ کے یہاں یورپ کے لوگ بڑے بڑے فوجی عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح افغانی سردار یہاں آکر مسلم بادشاہوں اور ہندو راجاؤں، دونوں کے یہاں اعلیٰ فوجی عہدہ حاصل کرتے تھے۔ گویا کہ آج جس طرح مغربی ملکوں کے ٹکنکل ماہرین ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح پچھلے زمانہ میں یورپ کے فوجی ماہرین یہاں کی فوجوں کا عہدے حاصل کیے ہوئے تھے۔ آج کے ماہرین ہوائی جہازوں پر سفر کرکے آتے ہیں، اُس زمانہ کے ماہرین پانی کے جہازوں پر سفر کر کے یہاں پہنچتے تھے۔

سردھنہ کے عظیم چرچ کے اندر بہت سے اسٹیچو ہیں۔ وہ سب سنگ مرمر کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کو اٹلی کے فنکاروں نے بنایا ہے۔ ایک سیاح کے الفاظ میں، وہ تعجب خیز حد تک خوب صورت (breathtakingly beautiful) ہیں۔ بیگم سمرو کا ایک مجسمہ ہے جس میں وہ چہرے پر لمبا گھونگھٹ نکالے ہوئے ہے۔ اور ہاتھ میں سانپ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے وہ ایک شرمیلی خاتون تھیں۔ لیکن مجرمین کو سزا دینے کے لیے وہ سانپ بن جاتی تھیں۔ یہ اسٹیچو پورا ایک ہی پتھر کا ہے۔ اس کو اتنی مہارت سے بنایا گیا ہے کہ وہ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔

ایک بڑی عمارت کے سامنے لکھا ہوا تھا سینٹ جان کی سیمنری (St. John's Seminary) اس کے اندر کچھ نوجوان پڑھتے ہوئے نظر آئے۔ سیمنری اس عیسائی مدرسہ کو کہا جاتا ہے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کا خالص مقصد یہ ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ فادر اور

عہدے دار تیار کیے جائیں جو چرچ کے نظام کو سنبھال سکیں۔

سردھنہ کا یہ مسیحی مرکز (کیتھولک مشن) تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ کتابچہ میں بتایا گیا تھا کہ بیگم سمرو کے انتقال کے بعد ان کی اسٹیٹ حکومت برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ مذکورہ ۶۵ ایکڑ کا علاقہ بیگم کی ذاتی ملکیت تھا، چنانچہ وہ محفوظ رہا۔ اس کے بعد وہ مختلف مراحل سے گزرا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۷ میں آگرہ کے آرچ بشپ نے اس کو ۲۵ ہزار روپے میں خرید لیا۔

سردھنہ کے اس مسیحی مشن کا آرکیٹکٹ ایک اطالوی میجر اینتھونی (Major Anthony Reghelini) تھا۔ وہ یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ اس کا رہائشی مکان اب بھی یہاں موجود ہے جو اینتھونی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد، اب یہ عمارت بچوں کے اسکول کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ کیتھولک مشن کی طرف سے مجھ کو جو تعارفی کتاب دی گئی اس کا نام تھا:

Sardhana: its Begum, its Shrine, its Basilica

۸۰ صفحہ کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھ کو سب سے زیادہ جس بات پر حیرت ہوئی یہ کہ اس مشن کی تاریخ دو سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں اس کے ساتھ طرح طرح کے نشیب و فراز پیش آئے۔ ملک کے سیاسی حالات میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ سردھنہ اور آگرہ سے لے کر اٹلی اور فرانس تک کے مختلف لوگ اس سے وابستہ رہے۔ حتی کہ خود بیگم سمرو کو خودکشی کا اقدام کرنا پڑا، اگرچہ وہ بچ گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

طرح طرح کے اونچ نیچ پیش آنے کے باوجود ادارہ نہ ٹوٹا اور نہ تقسیم ہوا۔ اور نہ اپنے مقصد کے اعتبار سے اس میں کوئی خلل واقع ہوا۔ وہ بدستور ترقی کے راستہ پر چلا جا رہا ہے۔

یہی ساری دنیا کے ہزاروں مسیحی اداروں کا حال ہے۔ میں نے خود کئی ایسے ادارے دیکھے ہیں جو سیکڑوں سال سے پرسکون طور پر چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو اس طرح تسلسل کے ساتھ چلا جا رہا ہو۔

یہ فرق روایات کی وجہ سے ہے۔ مسیحی قوموں میں روایات کا انتہائی احترام پایا جاتا ہے کسی روایت کو توڑنے والے ہمیشہ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر مسیحی لوگوں کی اطاعت کیشی کا

یہ حال ہے کہ ان کا کوئی بڑا آدمی کبھی کسی روایت کو نہیں توڑتا۔ وہ اپنے آپ کو روایت کے تابع رکھتا ہے، نہ کہ روایت کو اپنا تابع بنانے لگے۔ اور تاریخ کا تجربہ ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ روایات کے تحت چلتا ہے۔ جس سماج میں روایات توڑ دی جائیں وہاں کوئی قانون یا کوئی حکومتی اقتدار اس کا بدل نہیں بن سکتا۔

پیغمبر اسلام ؐ کے لائے ہوئے انقلاب میں اس حقیقت کا کامل شعور پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو احیاء اسلام، صفحہ ۶۰-۶۳) مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کو اس کا مطلق شعور نہ تھا۔ چنانچہ ہر مسلم لیڈر جوش جہاد میں روایتوں کو توڑتا رہا۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب عالم گیر نے انتہائی بے دردی کے ساتھ اپنے زمانہ کی تمام قیمتی روایات کو توڑ ڈالا۔ اس وقت سے آج تک مسلمان ایک ایسی قوم بنے ہوئے ہیں جن کے درمیان کوئی روایت ہی نہ ہو۔ جب کہ روایت کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اس کو توڑنا آسان ہے۔ لیکن دوبارہ روایت قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ایک پوری تاریخ کا عمل درکار ہوتا ہے :

It requires a lot of history to make a little tradition.

میں نے معلوم کیا کہ سردھنہ میں کیا ان لوگوں کی کوشش سے کچھ مسلمانوں نے عیسائیت قبول کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں صرف ایک خاندان ہے جس کے چھ افراد عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کے سوا کسی اور مسلمان نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا۔

یہی صورت حال ساری دنیا میں ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے بڑے پیمانہ پر اپنا تبلیغی عمل جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرلے۔ دوسری طرف دیگر مذاہب کے لوگ ساری دنیا میں ہر روز بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اسلام دین محفوظ ہونے کی وجہ سے فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب نے تحریف کی بنا پر فطرت سے اپنی مطابقت کھو دی ہے۔

سردھنہ میں، میرے خیال سے زیادہ بڑی کمی تعلیم کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر اسکول یا مدرسہ نہیں۔ تاہم مولانا محمد رضوان قاسمی تعلیم کے میدان میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی کوششوں سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا ہے۔ اور اس کو اعلیٰ معیار پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ ادارہ ترقی کرے گا۔ اور وہ سردھنہ کے مسلمانوں کی اس کمی کو پورا کرنے کا باعث بنے گا۔

میں نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ سردھنہ میں ایک لائبریری بنائیں۔ لائبریری صرف کتابوں کا ایک مکرہ نہیں، وہ دراصل لوگوں کو باشعور بنانے کی ایک خاموش تحریک ہے۔ اور اس کو ہر بستی اور ہر مقام پر ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں لائبریریوں کا عام رواج تھا۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی قائم کی ہوئی لائبریریوں میں بسا اوقات ایک لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہوتی تھیں۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ جن کتابوں کے ذریعہ ظہور میں آئی، اس کا بڑا حصہ مسلم کتب خانوں میں جمع شدہ عربی کتابوں سے حاصل ہوا تھا جن کو لے کر یورپی زبان میں ان کا ترجمہ کیا گیا (۱۵/۶۴۶)

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم اور کتب خانوں کا یہ بڑھا ہوا ذوق پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ تم علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے کچھ قیدیوں کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ان میں کا جو شخص مخصوص تعداد میں بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے تو وہ رہا کر دیا جائے گا (۱۵/۶۴۵)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا کوئی ایک سبب بتانا ہو تو یقیناً وہ یہی تعلیمی پچھڑاپن ہوگا۔

چرچ سے واپسی کے بعد کچھ دیر جناب عمران الزماں صاحب کے مکان پر ٹھہرے۔ انھوں نے چائے کے ساتھ ایک پورا دسترخوان بچھا دیا تھا جس پر کھانے کی مختلف چیزیں موجود تھیں۔ میں نے کہا کہ بھائی، میں ان مولویوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے سفرناموں میں لکھتے ہیں کہ "پر تکلف" کھانے کا انتظام تھا، ڈٹ کر کھایا" میرا اصول اس کے برعکس یہ ہے: کم کھانا، اور سادہ زندگی گزارنا۔

باہر خوانچہ والا آواز لگا رہا تھا: چیکو میٹھے، چیکو میٹھے۔ میں نے کہا کہ چیکو میٹھے ہی ہوتے
ں۔ پھر وہ بار بار میٹھا کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ دراصل اس کے جوش تجارت کی بنا پر ہے۔ اس کو
رف چیکو کہہ کر اطمینان نہیں ہوا۔ اس لیے اس نے اس میں مزید الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ یہ گویا عملِ
ید ہے۔ اور اس کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ لوگوں کے اندر حقیقی تڑپ ہو تو دین میں بھی اس
لِ مزید کے مظاہر دکھائی دینے لگیں گے۔

الرسالہ کے ایک قاری سے میں نے پوچھا کہ آپ کو اس سے کتنا اتفاق ہے۔ انھوں
نے کہا کہ ۹۰ فی صد۔ میں نے پوچھا کہ بقیہ ۱۰ فی صد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض
تلقین کرتے ہیں، اور اس سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ صبر و اعراض تو خالص قرآنی تعلیم ہے، پھر کیا آپ کو قرآن سے اتفاق نہیں۔
وں نے کہا کہ قرآن سے کس مسلمان کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے قرآن کے نظریۂ صبر سے
یں بلکہ الرسالہ کے نظریۂ صبر سے اختلاف ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں کا فرق مثال کے
یہ بتائیے۔ مگر وہ کوئی فرق نہ بتا سکے۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر صبر و اعراض کی بات
قبول نہیں کر پاتے۔ ان کو ٹکراؤ والا عمل تو معلوم ہے مگر انھیں صبر والا عمل معلوم نہیں۔ وہ
راؤ کو عمل سمجھتے ہیں اور صبر کو بے عملی۔ اب چونکہ ان کے اندر قرآن سے اختلاف کی جرأت
یں، اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں قرآن والے صبر سے نہیں بلکہ الرسالہ والے صبر سے
تلاف ہے۔ اس معاملہ میں ان کی غیر سنجیدگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان سے جب دونوں کا فرق
چھا جائے تو وہ فرق بتانے سے عاجز ثابت ہوتے ہیں۔

دوسری بات میں نے یہ کہی کہ صبر کوئی الرسالہ کی بات نہیں، وہ فطرت کا قانون ہے۔
ہر اس دنیا میں جینے کی قیمت ہے۔ اس لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ صبر کرنا ہے یا نہیں۔
ہ اصل سوال یہ ہے کہ آپ کو یہاں جینا ہے یا نہیں جینا ہے۔ اگر صبر نہیں تو زندگی بھی نہیں۔
س لیے یہ نہ کہئے کہ ہمیں صبر نہیں کرنا ہے، بلکہ یہ کہئے کہ ہمیں جینا نہیں ہے، ہم کو تو صرف
ہونا ہے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے اپنا ایک تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ "چند سال پیشتر آپ کے
فکر کی غلطی نامی کتاب چھپی تھی۔ وہ میری نظر سے گزری۔ پڑھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ مصنف
نے آپ کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے مشترک بنیادی فکر کی نشان دہی کی
پھر اس بنیادی فکر کو قرآن وحدیث کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن کتا
پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف خود تبصرہ وتنقید کے اصول سے ناواقف ہیں۔ اپنی کتا
میں تبصرہ وتنقید کا جو انداز انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی غلطی اسی سے ثابت ہے کہ اگر ا
کو تبصرہ کا معیار مان لیا جائے تو حدیث کی تمام کتابوں پر بھی بعینہٖ یہی تبصرہ صادق آئے گا جو انھ
نے فکر وحید پر چسپاں کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے تعارض کی مثال دی ہے۔ جب کہ حدیث
اندر بھی بظاہر اسی قسم کے تعارضات موجود ہیں۔ حالاں کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے
حدیث میں تعارض کا دعویٰ کیا جائے۔ تبصرہ نگار نے ایک اور بڑی غلطی یہ کی ہے کہ ایک جز
اور وقتی حالات سے متاثر کیفیت کو قاعدۂ کلیہ مان کر نتیجہ اخذ کیا ہے۔"

قرآن میں ہے کہ ——— اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کی خبر پا
تو وہ اس کو مذاق بنالیتا ہے (واذا علم من آیاتنا شیئا اتخذھا ھزوا) الجاثیہ ۹
یہاں یہ سوال ہے کہ قرآن تو مکمل طور پر ایک برحق کتاب ہے۔ پھر کوئی شخص
قرآن میں کس طرح ایسی شئی (چیز) پالیتا ہے جس کا وہ مذاق اڑا سکے۔ جواب یہ ہے
قابل استہزار شے کتاب میں نہیں ہوتی بلکہ غیر سنجیدہ آدمی کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے
کسی بھی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔ آدمی کے اندر سنجید
نہ ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی الٹی بات نکال کر اس کا مذاق اڑانے لگے گا۔ یہی وجہ
کہ ہدایت یابی کے لیے تقویٰ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی پابندی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے
تاثرات بتاتے ہوئے کہا: "صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو دین کی بے آمیز دعوت پر اٹھا
جائے۔ اور الرسالہ کو میں اسی معیار پر پاتا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ الرسالہ جو حقیقت پسندی ا
جو گہری نظر پیدا کرنا چاہتا ہے، آج اسی کی ضرورت ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ صفات پیدا

ں دنیا میں وہ آخرت کی کمائی کرنے والا نہیں بن سکتا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الرسالہ
یچر ہی عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہے اور الرسالہ بلاشبہ عصر حاضر میں اسلامی تجدید کا کام
ام دے رہا ہے۔"

سردھنہ میں نوابوں کا ایک خاندان ہے۔ ہندستان میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت
ئی تو انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے بعد انھیں
ت نوازا۔ ان نوازشوں کا فائدہ اب تک انھیں مل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارے رہنما دو سو سال سے بتا رہے ہیں کہ انگریز ایک مسلم دشمن اور
لام دشمن قوم ہے۔ اور اس کے ثبوت میں بتاتے ہیں کہ اس نے ہزاروں مسلمانوں کو سولی پر
ڑھا دیا۔ مگر تعرف الاشیاء باضدادھا کے اصول پر سوچنا چاہیے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی انگریز
ردھنہ میں (نیز دوسرے علاقوں میں) مسلمانوں کے ساتھ نوازش کا معاملہ کر رہے ہیں۔

اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اصل معاملہ مسلم دشمنی کا نہیں ہے۔
ں سے دشمنی کا ہے جو مفاد کے راستہ میں حائل ہو۔ دوسرے تمام لوگوں کی طرح، انگریز
پنے دشمن کا دشمن اور اپنے دوست کا دوست ہے۔ جس مسلمان کو اس نے اپنا مخالف پایا
ں کو اس نے اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور جس مسلمان نے اس سے موافقت کی اس پر
ں نے نوازشیں کیں۔

دہلی واپس آنے کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو میں نے سردھنہ کے نواب صاحبان کا قصہ
لمار اللہ صاحب (بنگلور) کو بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا ہی واقعہ ہماری ریاست کرناٹک میں
ا ہے۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے کافی کے باغات ہیں۔ ان کے مالک پہلے انگریز تھے۔
ب وہ اپنے ملک واپس جانے لگے تو انھوں نے بالقصد اپنے باغات مسلمانوں کو دیے۔
ر وزیادہ قیمت دینے کے لیے تیار تھے، مگر انھوں نے کم قیمت پر اسے مسلمانوں کے
ہ بیچ دیا۔

اس کا سبب بھی یہی ہے کہ جنوب کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اس
ت کا باغیانہ سلوک نہیں کیا جو شمال کے مسلمانوں نے کیا۔ اس لیے انھوں نے جنوب

کے مسلمانوں کو نوازا اور شمال کے مسلمانوں کو انھوں نے سزائیں دیں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو قومیں مسلمانوں کے اوپر غالب آئیں یا آج غالب ہیں، ان سب کے بارہ میں ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ سو سال سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اسلام دشمن لوگ ہیں اور سازش کے تحت انھوں نے غلبہ حاصل کیا ہے مگر یہ تصور لغویت کی حد تک غلط ہے۔

خدا کی اس دنیا میں کوئی گروہ محض دشمنی اور سازش کے ذریعہ سے کسی کے اوپر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ غلبہ کے لیے خدا کا قانون واضح ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس گروہ میں انسانی اوصاف زیادہ ہوں گے وہی گروہ یہاں غلبہ اور اقتدار حاصل کرے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب قوموں کے اندر انسانی اوصاف مسلم قوموں سے زیادہ تھے، اسی لیے وہ ان کے اوپر غالب آئے۔ اس کا ایک سادہ ثبوت یہ ہے کہ جن ملکوں کو مسلم قائدین اپنے اعلان کے مطابق، دشمن اسلام قرار دیے ہوئے ہیں، خود ان کے بیٹے اور پوتے پہلی فرصت میں بھاگ کر انھیں ملکوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں سٹل ہو سکیں۔

سردھنہ میں مجھے ایک مسلمان کے گھر میں دعا کے لیے لے جایا گیا۔ صاحب خانہ حال میں چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اب گھر میں ان کی بیوہ اور تین چھوٹے بچے ہیں۔ مرحوم نے اپنے بعد جائداد اور مکان وغیرہ چھوڑا ہے۔ اب کچھ لوگ ظالمانہ طور پر ان جائدادوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بیوہ کے اوپر فرضی مقدمات قائم کیے ہیں اور طرح طرح سے ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ حتی کہ بیوہ کے وکیل صاحب گھبرا کر یہ کہنے لگے ہیں کہ تم دوسرا وکیل کر لو۔ کیوں کہ وہ لوگ میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے ہر روز ہندو ظلم پر لکھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن اگر مسلم آبادیوں کا جائزہ لیا جائے تو برعکس طور پر معلوم ہوگا کہ ہندو کا ظلم مسلمان پر اگر ایک فیصد کے درجہ میں ہے تو مسلمان کا ظلم مسلمان پر ۹۹ فی صد کے درجہ میں ہے۔

سردھنہ کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں مجھے دوسرے قصبوں کے مقابلہ میں زیادہ صفائی نظر آئی۔ صفائی کا وہ معیار جو یورپ کے قصبات میں پایا جاتا ہے، اس۔

اگرچہ سردھنہ ابھی بہت دور ہے۔ تاہم ہندستان کے دوسرے قصبات کے مقابلہ میں ضرور وہ زیادہ صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر شمالی ہند کے قصبات کے مقابلہ میں۔

ایک مجلس میں مختلف سوالات ہوئے۔ ان کا تعلق اسلام سے بھی تھا اور مسلمانوں سے بھی۔ چند سوال و جواب یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جناب نبیل الرحمٰن صاحب پرنسپل انٹر کالج کی ایک تحریر مجھے دستی طور پر ملی۔ اس میں موصوف نے لکھا تھا :

"عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کے مضامین اخبار والرسالہ وغیرہ میں پڑھے لیکن میں ان سے پوری طرح متفق نہیں تھا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کو سردھنہ تشریف لائے۔ عشار بعد اور جمعہ بعد دونوں تقریر آپ کی سنی الحمدللہ بہت پسند آئیں سب خدشات دور ہو گئے۔

میری صاحبزادی میڈیکل لائن اختیار کرنا چاہتی تھی میں اس بارے میں مذبذب تھا۔ کسی محقق عالم دین کی جو دور جدید کے تقاضوں سے بھی واقف ہو، تلاش میں تھا یہ اوصاف آپ کی شخصیت میں نظر آئے۔ آپ نے بچی کے متعلق تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ دعا کی بھی تاکید کی کہ بچی کے بارے میں دعا کرتے رہو۔ اس سے طبیعت میں جو ایک قسم کی کھٹک تھی وہ دور ہو گئی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

ایک سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں کے یہاں کھانا پینا مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں میں نے کہا کہ کھانے پینے کے معاملہ میں جو فرق ہے وہ مسلم دستر خوان اور غیر مسلم دستر خوان کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ خود کھانے اور پینے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جس چیز کو کھانا یا پینا جائز ہے وہ ہر جگہ جائز ہے۔ اور جس چیز کو کھانا یا پینا حرام ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں یہ قاعدہ بتایا جاتا ہے کہ عدد ہمیشہ خاص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خاص لفظ کے معنی میں کمی یا زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ پھر احادیث میں عدد کی تعیین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے جو ارشادات ہیں، مثلاً تین سانس میں پانی پینا، تو آیا اس سے تعیین مراد لیا جائے گا یا تیسیر۔

میں نے کہا کہ چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کمیاتی نوعیت کی، اور دوسرے کیفیاتی نوعیت

کی۔ کمیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا ذکر ہو تو وہ متعین صورت میں مراد ہوگا، جیسے کعبہ کا سات بار طواف۔ لیکن کیفیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا لفظ محض تفہیم کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً "ایمان کے ستر شعبے ہیں" کا مطلب متعین مفہوم میں ستر نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب سادہ طور پر کثرت سے ہے۔ کیوں کہ ایمانی کیفیات کے اظہار کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک تین سانس میں پانی پینے کی بات ہے وہ تیسیر کے لیے ہے نہ کہ تحدید کے لیے۔

ایک فاضلِ دیوبند نے یہ سوال کیا کہ حدیث میں تجدید دین کے بارے میں روایتیں آئی ہیں کہ ہر سو سال کے بعد ایک مجدد آئے گا وہ تجدید دین کرے گا، تو اس حساب سے اب تک ۱۴۰۰ مجدد ہونا چاہیے۔ حالاں کہ مجددوں کی فہرست کے اندر اتنے نام نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ تجدید دین سے مراد، جزء دین کی تجدید ہے یا کل دین کی۔ اگر کل دین کی تجدید مراد ہے۔ تو ایسا کوئی مجدد اب تک نظر نہیں آیا جس نے کل دین کی تجدید کی ہو۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے لیکن تاریخ اسلام میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس نے دعوت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

میں نے کہا کہ حدیث میں "سو سال" کا لفظ اعتباری ہے۔ اس کی مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ دوسری بات یہ کہ جزئی تجدید کی ضرورت حالات کی تبدیلی کے تحت پیش آتی ہے۔ کیوں کہ حالات ہمیشہ بار بار بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں تک کلی تجدید کا تعلق ہے وہ دور کی تبدیلی پر آتی ہے۔ کلی تجدید کی ضرورت پہلی بار صرف موجودہ زمانہ میں پیش آئی ہے آج کا زمانہ ہر اعتبار سے ایک بدلا ہوا زمانہ ہے، اس لیے وہ کلی تجدید دین کا تقاضا کرتا ہے۔ ماضی میں کلی تجدید کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ایک سوال یہ تھا کہ کبر میں اور جرأت مندی میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ کبر کے پیچھے ذات کی برتری کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور جرأت مندی کے پیچھے حق کی برتری کا جذبہ۔

ایک سوال یہ تھا کہ تواضع اور احساس کمتری میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تواضع کی کیفیت خدا کو بلند و برتر ماننے سے ابھرتی ہے۔ اور کمتری کا احساس انسان کو بلند و برتر سمجھنے سے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مصلحت پسندی میں اور مداہنت میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ مصلحت کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ اور مداہنت ہمیشہ ذاتی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

کون آدمی دینی مصلحت پر ہے اور کون آدمی ذاتی مداہنت پر، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جو آدمی دینی مصلحت کی بنا پر ایک طریقہ اختیار کرے، اس کی زندگی میں تضاد نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جو آدمی ذاتی مداہنت کی روش پر ہو، اس کی زندگی میں لازماً تضاد پیدا ہو جائے گا۔

مثلاً آپ ایک دولت مند ملک میں ہیں۔ وہاں آپ کو بہت بڑی تنخواہ مل رہی ہے اور آپ دفتر کے نظام میں حد درجہ موافقت کر کے رہتے ہیں۔ اب اگر آپ کی موافقت اصول کی بنا پر ہو تو اپنے گھر کے اندر بھی آپ اس نظام کی تعریف کریں گے جس طرح آپ دفتر میں کرتے ہیں۔ اور اگر آپ بااصول نہ ہوں تو آپ کا حال یہ ہوگا کہ دفتر کے اندر نظام کے حق میں اچھے الفاظ بولیں گے گھر کے اندر اس کے حق میں برے الفاظ۔ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ انسان بن کر رہ جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصلحتِ دینی ایک بااخلاص عمل ہے، اور مداہنت سرتاسر ایک منافقانہ عمل۔ ایک عمل سے انسان کی شخصیت بلند ہوتی ہے، جب کہ دوسرا عمل آدمی کی شخصیت کو کثیف بنا کر رکھ دیتا ہے۔

۱۲ اپریل کو جمعہ تھا۔ سردھنہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے، اندر سے باہر تک نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ موجودہ مسلمانوں سے جو سب سے بڑی چیز اٹھ گئی ہے وہ شکر خداوندی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ ایک مسجد کے ساتھ کسی وجہ سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو ہر زبان اور ہر قلم اس کے پرجوش تذکرہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مگر اسی ملک میں لاکھوں مسجدیں شاندار طور پر آباد ہیں اور اس کے تذکرہ میں کوئی رطب اللسان نہیں۔

جمعہ کے بعد میری تقریر کا اعلان ہوا۔ بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں علم کی اہمیت بیان کی۔ میں نے کہا کہ قرآن میں پہلی آیت اقرا (پڑھ) کا اترنا بتاتا ہے کہ علم سفرِ اسلام کا

آغاز ہے۔ اس سلسلے میں تاریخی مثالیں دیتے ہوئے بتایا تھا کہ علم سے مراد سند اور سرٹیفکٹ والا علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ علم ہے جو آدمی کو باشعور بنائے۔ جو مومن کو صاحب فراست انسان بنادے۔ جو عسر میں یسر دیکھنے کی نظر پیدا کرے۔ جس کا یہ نتیجہ ہو کہ آدمی پہاڑوں کو دیکھ کر اس سے تقویٰ اور خشیت کی غذا لینے لگے۔

سفر کے آخر میں مولانا محمد عرفان قاسمی (استاذ حدیث) نے اپنا تاثر تحریری صورت میں لکھ کر دیا۔ یہ انھیں کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

" اسلامی تاریخ میں بے شمار دُعاۃ و مبلغین پیدا ہوئے ہیں، لیکن صاحب الرسالہ اپنی نوعیت کے پہلے داعی ہیں جنھوں نے اسلام کے دعوتی پہلو کو نمایاں کیا ہے، موصوف نے دین کے اساسی اصول کو مرکز توجہ بنایا ہے، حق تعالیٰ نے آنجناب کو عصر حاضر میں تجدید دین واجب اسلام کے لیے مبعوث فرمایا۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں جہاں دین کے اندر غیر دین کی آمیزش ہوگئی تھی، وہیں احیار اسلام کے لیے موافق اسباب بھی جمع ہو گئے تھے، حضرت مولانا نے نہ صرف دین کو بے آمیز بنایا بلکہ موافق اسباب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ، اس کو بھرپور استعمال کی کوشش کی، تاکہ فکر اسلامی کو دنیا کے اندر غالب فکر کا مقام عطا ہو سکے، سچ تو یہ ہے کہ دعوت دین کی تحریک کو جس پیغمبرانہ طریقہ پر چلایا، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل کے آنجناب واحد حقیقی مصداق ہیں۔"

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو جمعہ کی نماز اور تقریر کے بعد ایک صاحب کے مکان پر چائے کی نشست ہوئی۔ یہاں دوبارہ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

آج کے اخبار میں "ضلع میرٹھ" کا خبرنامہ چھپا ہوا تھا۔ اس میں قتل یا حادثاتی موت کے آٹھ واقعات درج تھے۔ کسی دیہات میں گھریلو جھگڑوں میں ایک آدمی نے دوسرے کو مار ڈالا۔ کہیں سڑک پر دو سواریوں کی ٹکر میں کوئی شخص ہلاک ہوگیا۔ وغیرہ۔ (قومی آواز ۱۲ اپریل ۱۹۹۶)

میں نے کہا کہ دیکھئے، میں دو دن سے میرٹھ کے علاقہ میں ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات میرے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ گویا کہ چار ملین آبادی کے ضلع میں یہ محض استثنائی واقعات ہیں نہ کہ عمومی واقعات۔ لیکن اگر میں میرٹھ سے دور ہوتا اور صرف اخبار ہی میرے لیے میرٹھ ضلع کو جاننے کا ذ

دتا تو یہی استثنائی واقعات میرے لیے کل واقعات بن جاتے۔ میں انھیں سے میرٹھ ضلع کی تصویر بناتا۔ پھر میں سمجھ لیتا کہ میرٹھ تو صرف قتل اور موت کا ایک علاقہ ہے۔

میں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں ہزار سال سے امن اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ سو سال پہلے جب یہاں اخبار کا دور آیا اسی وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کی مصنوعی تصویر دکھانے لگے۔ پچھلے زمانہ میں باہمی اختلاط ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ تھا، اب اخبارات ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر سردھنہ میں دونوں فرقے باہم مل کر رہتے ہیں۔ مگر یہ بات اخبار میں نہیں چھپے گی۔ البتہ کبھی کسی ہندو اور کسی مسلمان میں لڑائی ہو جائے تو وہ فوراً اخبار میں چھپ جاتا ہے۔ اس قسم کی منفی رپورٹنگ دونوں طرف ہو رہی ہے۔ ہندی اخبار اس قسم کی ادھوری رپورٹنگ کے ذریعہ ہندوؤں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ اسی طرح اردو اخبار اسی قسم کی ناقص رپورٹنگ کے ذریعہ مسلمانوں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ یہی غیر فطری ذہن کبھی کسی اتفاقی سبب سے بھڑک اٹھتا ہے تو وہ فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہو کر دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ سردھنہ سے گزر کر ہماری گاڑی میرٹھ کے بازار میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں سرگرم طور پر مختلف تجارتوں میں مشغول ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مسلمان اس نظریہ کو رد کر رہے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ اسی طرح ہندو اس پروپگنڈے سے باہر نکل آئے ہیں کہ مسلمان ان کے لیے ایک غیر مطلوب فرقہ ہیں۔ اب دونوں از سر نو ایک دوسرے کو قبول کر رہے ہیں۔ مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے مواقع سے بھرا ہوا ایک ملک ہے۔ ایک عرصہ تک وہ نااہل لیڈروں اور بے بصیرت دانش وروں کے بہکاوے میں رہے۔ اب وہ اس فریب سے باہر آ گئے ہیں۔

اسی طرح ہندو جو بعض پروپگنڈوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو "بابر کی سنتان" کے روپ میں دیکھنے لگا تھا، اب وہ ان کو فرزندان وطن کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ ان کو ہندستان کی

متحدہ قومیت کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھ رہا ہے۔ وہ ان کو اپنے بھائی کے روپ میں دیکھ رہا ہے نہ کہ رقیب اور حریف کے روپ میں۔ یہ صورت حال جو آج ہر جگہ دکھائی دے رہی ہے وہ بلاشبہہ ایک صحت مند سماج کی علامت ہے، اور وہ یقینی طور پر ملک کے لیے ایک نئے اور بہتر مستقبل کی آمد خبر دے رہی ہے۔

ضلع میرٹھ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقی کے وافر مواقع موجود ہیں۔ مگر میرٹھ کو، خاص طور پر یہاں کے مسلمانوں کو جتنی ترقی کرنا چاہیے تھا، اتنی ترقی وہ نہ کر سکے۔ اس کا سبب غالباً یہاں کے لوگوں کا وہ مزاج ہے جو ۵۹-۱۸۵۷ کی بغاوت میں شرکت کے نتیجہ میں فطری طور پر بنا۔

میرٹھ سے آگے ایک نہر ہے جس کے اوپر پل بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ گنگا نہر ہے۔ ۱۹۸۷ کے فساد میں پچاس سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو گولی مار کر اس نہر میں ڈال دیا گیا تھا اس واقعہ کی ضروری تفصیل الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۳۴-۳۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جب گنگا نہر کے بہتے ہوئے پانی پر میری نگاہ پڑی تو میں نے سوچا کہ کیا یہ پانی نو سال پہلے ہونے والے واقعہ کی تفصیل بتائے گا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ وہ پانی اب یہاں کہاں ہے۔ وہ وہ تو بہہ کر سمندر میں جا چکا۔ پھر خیال آیا کہ وہ پانی اب سمندر میں بھی نہیں ہوگا۔ وہ بھاپ بن کر فضا میں چلا گیا ہوگا اور پھر بادل بن کر کہاں کہاں برسا ہوگا، اب کسی کو بھی یہ معلوم نہیں۔

مگر خدا کے علم میں یہ ساری باتیں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کی قدرت میں ہے کہ وہ حکم دے اور تمام چیزیں دوبارہ اکٹھا ہو کر پورے واقعہ کو ٹھیک اسی طرح سنا دیں جس طرح وہ ۲۳ مئی ۱۹۸۷ کو پیش آیا تھا۔ اس دن کون ظالم ثابت ہوگا اور کون مظلوم قرار دیا جائے گا، اس کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں۔

راستہ میں ہم مودی نگر سے گزرے۔ یہاں ایک شوگر مل ہے۔ اس کے پاس دور تک سڑک کے کنارے گنا لانے والوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی، کسان اپنا اپنا گنا ٹریکٹر پر لاد کر یہاں لائے تھے اور اب اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

سب سے پہلے یہ منظر میں نے مشرقی یوپی میں شاہ گنج کی مل میں دیکھا تھا۔ اس وقت

سان اپنا گنا بیل گاڑیوں پر لاد کر لاتا تھا۔ اس کے بعد کرایہ کے ٹرک کے اوپر لدے ہوئے گنے سڑکوں پر دکھائی دینے لگے۔ اب کسان اپنا گنا اپنے ٹریکٹر پر لاد کر لاتا ہے۔ یہ ملک میں کسان کی ترقی کا ایک علامتی واقعہ ہے۔ بیل گاڑی کے بعد کسان کرایہ کے ٹرک استعمال کرتے تھے، اب انھوں نے خود اپنے ٹریکٹر خرید لیے ہیں جو پیداوار حاصل کرنے کا کام بھی کرتا ہے اور فصل کو لاد کر بازار بھی پہنچاتا ہے۔

مودی نگر پہلے میرٹھ ضلع کا ایک حصہ تھا۔ اب وہ انتظامی اعتبار سے غازی آباد میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہاں ۲۷ اپریل کو ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ یوپی روڈ ویز کی ایک بس جو دہلی سے رڑکی جا رہی تھی، وہ مودی نگر پہنچی تو اس کے اندر ایک بم پھٹا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن آدمی مر گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں گیارہ مہینہ کا ایک بچہ بھی شامل تھا۔ بم بس کے اگلے حصہ میں ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ باہر کی دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ہندستان ٹائمس (۲۹ اپریل) کے مطابق، کشمیر کے ایک عسکری گروہ اسلامی رکت المومنین نے اس بم دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ (تباہ شدہ بس کی تصویر نیچے ملاحظہ فرمائیں)

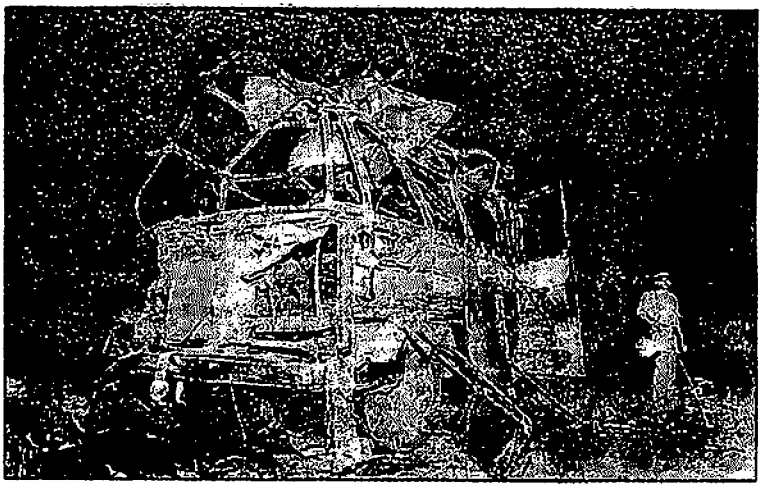

The mangled remains of the ill-fated UP Roadways bus (UP-15A-6693)

موجودہ زمانہ میں ناراض عناصر اس قسم کی وحشیانہ کارروائیاں ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہے کہ ان کا کوئی آدمی جب ایسا فعل کرتا ہے تو اس کا عمل جہاد قرار پاتا ہے۔ اور وہ خود مجاہد کا لقب پاکر اپنی قوم کے درمیان ہیرو بن جاتا ہے۔

راستہ میں ایک جگہ ریلوے کراسنگ تھی، کوئی ٹرین آرہی تھی، اس لیے دونوں طرف کے گیٹ بند کر دیے گئے تھے۔ ہماری گاڑی کھڑی ہوگئی۔ میں نے اتر کر دیکھا تو دونوں طرف سڑک کے اوپر دور تک گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر کوئی کہے کہ صرف ایک ٹرین کو گزارنے کے لیے اتنی زیادہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ٹریفک کا یہ اصول بالکل غیر منصفانہ ہے تو یہ جملہ قواعد کے لحاظ سے درست مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوگا۔ کیوں کہ یہ کم تعداد اور زیادہ تعداد کا مسئلہ نہیں، یہ ترجیح اور تنظیم کا مسئلہ ہے۔ اور جہاں اس طرح کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کم ہے اور کون زیادہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ کو دیکھنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے، اور دوسرا غلط رخ۔ فرق کی اس حکمت کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کسی معاملہ میں ایک فیصلہ کرے گا۔ اپنی جگہ پر وہ سمجھے گا کہ میں درست ہوں۔ حالاں کہ وہ سراسر غلطی پر ہوگا۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہوگی کہ وہ معاملہ کو غلط رخ سے دیکھ رہا ہوگا۔

مثلاً آج کل دنیا بھر کے مسلم علماء اور دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر متحد ہوگئی ہیں۔ یہود و ہنود اور صہیونی طاقتیں اور صلیبی طاقتیں سب کی سب چاہتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دیں۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ پھر ایک بے بنیاد بات پر مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے کیوں اس طرح متفق ہو گئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک واقعہ کو وہ غلط رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا بھر میں غیر موافق حالات کا تجربہ پیش آرہا ہے۔ مگر اس معاملہ کا تعلق قانون فطرت سے ہے نہ کہ انسانوں کی مخالفانہ کارروائیوں سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کا نظام اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں انسانوں

کے درمیان مقابلہ ہو۔ یہاں ترقی کا عمل مقابلہ اور مسابقت کے ذریعہ جاری رہتا ہے۔ جو کبھی کبھی عداوت تک پہنچ جاتا ہے (بعضکم لبعض عدو) ہمارے علماء اور دانشوروں کی غلطی یہ ہے کہ جس واقعہ کو انھیں قانونِ فطرت کے رخ سے دیکھنا چاہیے تھا اس کو وہ انسانی سازش اور انسانی عداوت کے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ معاملہ کو قانون فطرت کے رخ سے دیکھتے تو موجودہ صورت حال کو ایک چیلنج سمجھ کر اس کے حل کی تدبیر ڈھونڈتے۔ مگر جب انھوں نے اس کو انسانی سازش کی نظر سے دیکھا تو ان کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ مفروضہ دشمنوں کی سازش اور عداوت کا انکشاف کریں اور سمجھیں کہ ہم ایک کام کر رہے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو ہم سے بھی زیادہ سازش اور مخالفت کا سامنا پیش آیا۔ مگر وہ تمام سازشوں اور مخالفتوں کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ شعوری اور کرداری طاقت کا ہے۔ وہ لوگ شعور اور کردار میں طاقت ور تھے اس لیے کوئی سازش انھیں نقصان نہ پہنچا سکی۔ موجودہ مسلمان شعور اور کردار کے اعتبار سے جان ہو چکے ہیں اس لیے وہ بآسانی ہر سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب میں دہلی واپس آ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ سردھنہ کے سفر سے مجھ کو کیا ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سردھنہ کے دو روزہ قیام کے دوران میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا وہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ بظاہر اس غیر اہم مقام پر بہت سی ایسی باتیں میرے علم میں آئیں جو اس سفر سے پہلے مجھے معلوم نہ تھیں۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے "معلوم" ہی کو وہ سب کچھ سمجھ لے۔ عین ممکن ہے کہ یہاں اور بھی بہت سے باتیں ہوں جو آدمی کے لیے ابھی تک لامعلوم ہوں، حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے اسی دنیا میں وہ پوری طرح موجود ہوں۔

یہ بات انسان کے لیے بھی ہے اور دوسری چیزوں کے لیے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے سلسلہ میں ہمیشہ حسن ظن کی تاکید کی گئی ہے۔ حسن ظن آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ کسی کے بارہ میں ایسی رائے قائم کر لے جو بطور واقعہ درست نہ ہو (الحجرات ۶)

یہی معاملہ دوسری چیزوں کا ہے۔ آدمی سفر میں نئے نئے مقامات دیکھتا ہے اور

نئی نئی باتیں سیکھتا ہے۔ اسی لیے سیاحت کو قرآن میں مومن کی ایک صفت بتایا گیا ہے۔ امام رازی نے سائحون اور سیاحت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: السائحون فی الارض لطلب العلم۔ السیاحۃ ھی الذھاب فی المدن للعظۃ والاعتبار۔ اگر آدمی کے اندر توسُّم (الحجر ۷۵) کی صفت موجود ہو تو ہر سفر اس کے لیے ایک عظیم درس عبرت بن جائے گا۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو مغرب کے وقت میں دہلی واپس آگیا۔ زندگی پوری کی پوری اسی قسم کا ایک وسیع تر سفر ہے۔ آدمی اپنی قیام گاہ سے نکل کر کہیں جاتا ہے اور دوبارہ اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا ہے۔ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا، یہاں تک کہ انسان اپنی آخری منزل، آخرت تک پہنچ جائے۔

جب میں دہلی پہنچا تو کل کے دن مکان کے جس گیٹ سے نکل کر میں گاڑی میں بیٹھا تھا، آج گاڑی سے نکل کر دوبارہ اسی گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت مجھے یہ دعا یاد آئی:

رب ادخلنی مُدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنك سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل ۸۰)

کچھ سیاسی ذوق رکھنے والوں نے لفظی مشابہت کی بنا پر یہاں سلطان کو سیاسی اقتدار کے معنی میں لے لیا ہے۔ یہ اس کی معنویت کو غارت کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں سلطان سے مراد نصرتِ لدنی یا نصرتِ الٰہی ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر حضرت موسیٰ کے لیے فرمایا سنشد عضدك باخیك ونجعل لكما سلطانا فلا یصلون الیكما (القصص ۳۵) یہ مدد کی وہ قسم ہے جو خصوصی طور پر داعیٔ حق کو ملتی ہے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اس دعا کا تعلق مُدخل اور مُخرج دونوں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا، نکلنے میں بھی تو میری مدد فرما اور داخل ہونے میں بھی تو میری مدد فرما۔ ہر وقت اور ہر لمحہ کے لیے تو میرا طاقت ور مددگار بن جانا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال $20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال $35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال $50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال $80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ) $100 / £50	

Finest collection of books on Islam

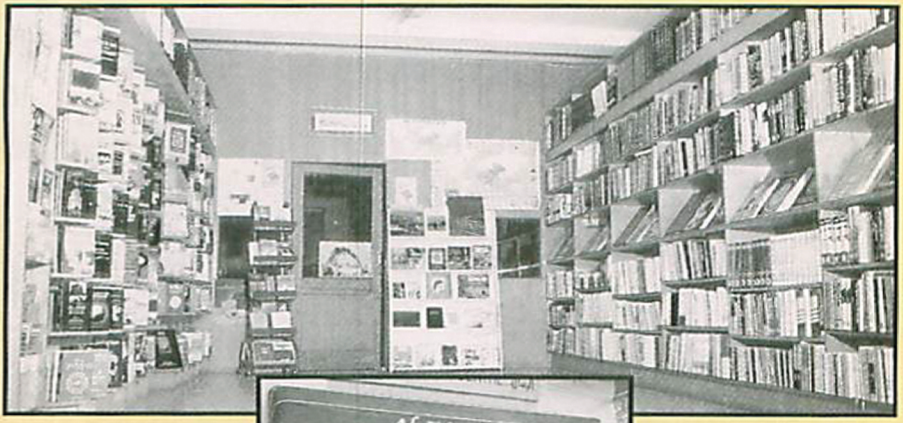

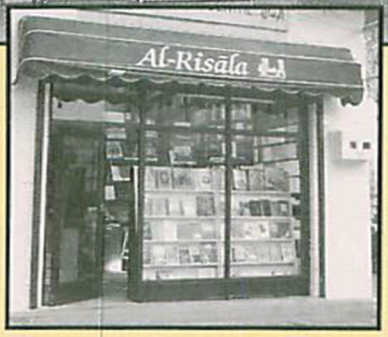

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333

RNI 28822/76 • U(SE) 12/96
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96